جدید فارسی شاعری

ترجمہ

از

ن۔ م۔ راشد

مجلسِ ترقیِ ادب

کلب روڈ۔ لاہور

قدیم زمانے میں اردو شاعری کئی طرح سے فارسی شاعری سے متاثر ہوئی - اس کے برعکس جدید فارسی شاعری نے براہ راست اردو شاعری پر کوئی اثر نہیں ڈالا ، بلکہ جدید فارسی شاعری کے بارے میں ہمارے ہاں بڑی حد تک لا علمی پائی جاتی ہے -

تاہم یہ عجیب بات ہے کہ اردو اور فارسی میں جدید شاعری کی تحریک قریب قریب ایک ہی زمانے میں شروع ہوئی - اردو میں یہ تحریک ۳۲ - ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ شروع ہو گئی تھی اور فارسی میں اس کا ظہور ۱۹۳۵ء کے قریب ہوا - ہرچند دونوں زبانوں میں جدت کی تحریک مغربی شاعری سے متاثر ہوئی ہے ، لیکن یہ محض انگریزی یا فرانسیسی شاعری کا اثر نہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ آن سیاسی ، اقتصادی اور اجتماعی حالات کا نتیجہ تھا جو اس وقت رونما ہو رہے تھے کہ دونوں زبانوں کے شاعروں نے آزادی کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا - اسی وجہ سے دونوں زبانوں کی شاعری نے قریب قریب متوازی راستے طے کیے ہیں -

جدید فارسی شاعری

ترجمہ

از

ن-م-راشد

مجلسِ ترقیِ ادب

کلب روڈ-لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : فروری ۱۹۸۷ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی

ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

طابع : ایس - ایم - اظہر رضوی

مطبع : اظہر سنز پرنٹرز ، لٹن روڈ ، لاہور

قیمت : ۵۰ روپے

فہرست مندرجات

صفحہ نمبر

استدراک ... ... س

تمہید : از ن - م - راشد ۱

نیما یوشیج ۲

فریدون تولّلی ۷

مہدی اخوان ثالث ۸

احمد شاملو ۱۲

اسماعیل شاہرودی ۱۵

سیاوش کسرائی ۱۸

ہوشنگ ابتہاج ۱۹

محمد زہری ۲۰

سہراب سپہری ۲۱

نادر نادر پور ۲۳

صفحہ نمبر

۳ - احمد شاملو : ... ۸۹

۹ - آیدا در آینہ : ۹۱

آیدا آئینے میں ... ۹۳

۱۰ - من مرگ را . . . : ۹۷

میں نے موت کو ... ۹۸

۱۱ - احساس : ۱۰۰

احساس ... ۱۰۱

۱۲ - مہ : ۱۰۳

کہر ۱۰۴

۴ - اسماعیل شاہرودی : ... ۱۰۷

۱۳ - آبی رنگ : ۱۰۹

نیلا رنگ ۱۱۴

۱۴ - باغستان سبز : ۱۲۰

سبز باغوں کی سرزمین ... ۱۲۰

۵ - محمد زہری : ۱۲۳

صفحہ نمبر

۱۵ - زائران شہید : ۱۲۵

زائروں کی شہادت ۱۲۶

۱۶ - تلاش : ۱۲۸

تلاش ۱۲۸

۶ - ہوشنگ ابتہاج : ۱۳۱

۱۷ - تشویش : ۱۳۳

تشویش ۱۳۵

۱۸ - شبگیر : ۱۳۹

سویرا ۱۴۰

۱۹ - گریہ : ۱۴۲

رونا ۱۴۲

۷ - مہدی اخوان ثالث : ۱۴۵

۲۰ - آخر شاهنامہ : ۱۴۷

شاہنامے کا آخر ۱۵۲

۲۱ - پیوندھا و باغ : ۱۵۹

باغ اور پیوند ۱۶۲

صفحہ نمبر

۲۲ - نماز : ۱۶۶

نماز ۱۶۷

۸ - سہراب سپہری : ۱۶۹

۲۳ - جشن واژۂ زیست : ۱۷۱

زندگی کا متحرک بول ۱۷۲

۲۴ - ہمیشہ : ۱۷۳

ہمیشہ ۱۷۵

۲۵ - شب : ۱۷۷

رات ۱۸۰

۲۶ - آب : ۱۸۵

پانی ۱۸۶

۹ - نادر نادر پور : ۱۸۹

۲۷ - حماسۂ در غروب : ۱۹۱

غروب آفتاب کا رجز ۱۹۵

۲۸ - نقاب و نماز : ۲۰۰

نقاب اور نماز ۲۰۳

صفحہ نمبر

۲۹ - بعد از هزار سال : ۲۰۷
ہزاروں سال بعد ۲۰۹
۳۰ - شیهۀ خاموش : ۲۱۲
خاموش ہنہناہٹ ۲۱۳
۳۱ - از آسمان تا ریسمان : ۲۱۶
آسمان سے ریسمان تک ۲۲۰
۰۱ - منوچهر آتشی : ۲۲۵
۳۲ - آنانکه مرگ را سپری . . . : ۲۲۷
جنھوں نے موت کو ڈھال ۲۳۲
۳۳ - در انتهای شب ۲۳۸
بھیگی رات ۲۳۹
۳۴ - پرسش : ۲۴۱
ایک سوال ۲۴۲
۳۵ - یک روز : ۲۴۳
ایک دن ۲۴۴
۳۶ - شاید : ۲۴۷
شاید ۲۴۸

صفحہ نمبر

۱۱ - ید اللہ رؤیائی :

۳۶ - بر جادہ ھای تہی : ۲۵۱

سونے راستوں پر ۲۵۳

۳۸ - شعرھای دریائی : ۲۵۵

سمندر کی نظمیں ۲۵۹

۳۹ - دلتنگی ھا : ۲۶۰

اداسیاں ۲۶۲

۴۰ - پائیزِ سبز : ۲۶۳

سبز خزاں ۲۶۴

۴۱ - اشکم را . . . : ۲۶۵

اپنے آنسو ۲۶۷

... ... ۲۶۸

۱۲ - فروغ فرخ زاد :

۴۲ - تولدی دیگر : ۲۷۱

دوسرا جنم ۲۷۳

... ... ۲۷۶

۴۳ - وہمِ سبز : ۲۸۱

سبز وہم ۲۸۵

صفحہ نمبر

۴۴ - آیہ ھای زمینی : ۲۹۰
زمین کی نشانیاں ۲۹۵
۴۵ - دریافت : ۳۰۱
انکشاف ۳۰۳
۴۶ - تنہائیِ ماہ : ۳۰۵
چاند کی تنہائی ۳۰۸
۱۳ - محمود کیالوش : ۳۱۱
۴۷ - گُم‌تم مرود : ۳۱۳
میں نے کہا گیت ۳۱۴
۴۸ - انسان شقایق نیست : ۳۱۷
انسان لالہ صحرائی نہیں ۳۱۹
۴۹ - کدام درد ؟ : ۳۲۳
کون سا درد ؟ ۳۲۶
۱۴ - رضا براھنی : ۳۳۱
۵۰ - تغزلی حماسی : ۳۳۳
ایک رجزیہ غزل ۳۳۶

صفحہ نمبر

۱۵ - محمد حقوق : ۳۴۳

۵۱ - در سایہ سراب : ۳۴۵

سراب کے سائے میں ۳۴۶

۵۲ - مقصد شراب خانہ شرق بود : ۳۴۹

مقصد تھا مشرق شراب خانہ ۳۵۰

۱۶ - اسماعیل خوئی : ۳۵۳

۵۳ - شہال لیز : ۳۵۵

شہال بھی ۳۵۹

۵۴ - در امتدادِ زرد خیابان : ۳۶۵

سڑک کی خاکی لمبائی میں ۳۷۰

۱۷ محمد رضا شفیعی کدکنی : ۳۷۵

۵۵ - مزامیرِ گلِ داوودی : ۳۷۷

گلِ داؤدی کے ساز ۳۷۹

۵۶ - آوازِ بیگانہ : ۳۸۲

اجنبی کی آواز ۳۸۳

۵۷ - گل ھای زندان : ۳۸۶

زندان کے پھول ۳۸۷

صفحہ نمبر

۱۸ - محمد علی سہانلو :

۵۸ - عجب غریبم من : ۳۸۹

اجنبی ۳۹۱

... ... ۳۹۲

۱۹ - احمد رضا احمدی :

۵۹ - آغاز در تدفین : ۳۹۳

تدفین کی ابتدا ۳۹۵

... ... ۳۹۶

۶۰ - گمان رو در روی زیبائی : ۳۹۷

گمان ، حسن کے روبرو ۳۹۹

استدراک

جدید فارسی شعرا کے یہ تراجم متعدد جہات سے اہم ہیں ۔ اس کے مترجم ن ۔ م ۔ راشد ہیں جو اردو کے ایک بڑے شاعر تھے ۔ تہران میں چند برس کے قیام کے دوران میں وہ جدید فارسی پر پوری طرح حاوی ہو گئے تھے ، اس لیے جدید فارسی شاعری کا یہ اردو ترجمہ اصل کے بہت قریب ہے ۔ پھر مجلس کو یہ تراجم اردو کے ایک اور بڑے شاعر فیض احمد فیض کے توسط سے موصول ہوئے تھے ۔ مجلس کے معزز ارکان کے اجلاس میں طے پایا تھا کہ اگر مترجم اصل نظمیں مہیا نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے صاحبِ ذوق سے درخواست کرنا چاہیے کہ وہ مجلس کے ساتھ اس ضمن میں تعاون کریں ۔ چنانچہ مسودہ عرصے تک پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ہاں پڑا رہا مگر وہ اپنی مصروفیات کے باعث مجلس کی مدد نہ کر سکے ۔ پھر ڈاکٹر عبدالشکور احسن صاحب سے گزارش کی گئی مگر وہ بھی بوجوہ مجلس کی ضرورت کو پورا نہ کر سکے ۔ آخر پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر آفتاب اصغر صاحب سے عرض کیا گیا ۔ انھوں نے علم پروری اور فن دوستی سے کام لیتے ہوئے ان تراجم کے اصل متون کی تلاش و جستجو کا کام شروع کیا ۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں انھیں بہت کاوش اور دیدہ ریزی سے کام لینا پڑا اور مجلس ان کی بے حد شکر گزار ہے ۔ آخر یہ مرحلہ طے ہوا مگر چند نظمیں ایسی بھی تھیں جن کے تراجم تو موجود

تھے مگر اصل متون دستیاب نہیں ہو سکے ۔ مناسب یہی سمجھا گیا کہ تراجم کے ساتھ اصل لفظیں درج کرنے کا التزام شروع سے آخر تک برقرار رکھا جائے کہ قارئین کرام ان تراجم سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں ۔ اس لیے ان چند تراجم کو خارج کر دیا گیا ہے جن کے اصل متن مہیا نہیں ہو سکے ۔ اگر اس دوران میں اصل لفظیں دستیاب ہوتی رہیں تو آئندہ ایڈیشنوں میں انھیں شامل کیا جاتا رہے گا ۔

احمد ندیم قاسمی ، ناظم

تمہید

قدیم زمانے میں اردو شاعری کئی طرح سے فارسی شاعری سے متاثر ہوئی - اس کے برعکس جدید فارسی شاعری نے براہِ راست اردو شاعری پر کوئی اثر نہیں ڈالا - بلکہ جدید فارسی شاعری کے بارے میں ہمارے ہاں بڑی حد تک لاعلمی پائی جاتی ہے -

تاہم یہ عجیب بات ہے کہ اردو اور فارسی مین جدید شاعری کی تحریک قریب قریب ایک ہی زمانے میں شروع ہوئی - اردو میں یہ تحریک ۱۹۳۲-۳۳ء کے لگ بھگ شروع ہو گئی تھی اور فارسی میں اس کا ظہور ۱۹۳۵ء کے قریب ہوا ، جب نیمایوشیج نے اپنی پہلی آزاد نظم ایک ادبی رسالے "موسیقی" کی ادارت میں شامل ہونے کے بعد شائع کی - ہرچند دونوں زبانوں میں جدّت کی تحریک مغربی شاعری سے متاثر ہوئی ہے ، لیکن میرے خیال میں یہ محض انگریزی یا فرانسیسی شاعری کا اثر نہ تھا ، بلکہ اس سے کہیں زیادہ آن سیاسی ، اقتصادی اور اجتماعی حالات کا نتیجہ تھا جو اس وقت رونما ہو رہے تھے کہ دونوں زبانوں کے شاعروں نے آزادی کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا - اسی وجہ سے دونوں زبانوں کی شاعری نے قریب قریب متوازی راستے طے کیے ہیں -

اس مجموعے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ دونوں زبانوں کی جدید شاعری میں کس حد تک قُرب پایا جاتا ہے - ہیئت اور زبان ہی کی

تبدیلیاں ایک جیسی نہیں ، بلکہ رموز و کنایات کے نئے نئے تصورات ، تجربات اور تاثرات کی انفرادیت ، موضوعات میں تنوّع کی تلاش اور نئے علوم کی روشنی میں زندگی کی نئی تعبیر کی کوششیں بڑی حد تک یکساں ہیں ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دونوں زبانوں کی شاعری میں اب قدیم شاعری کی غربت اور واماندگی کا سراغ کم ملتا ہے ـــ وہ قدیم شاعری جو خود غرض ، لیکن ستم رسیدہ ، عشق کی پیداوار تھی اور جس کی آبیاری اخلاق اور تصوف کے مسلّمہ نظریات کیا کرتے تھے ۔ آج کی شاعری میں محض زندگی سے اُکتاہٹ نہیں پائی جاتی ، بلکہ مجموعی بے اطمینانی کا پرتو ملتا ہے ۔ اور اسی وجہ سے شاعر اپنے ذاتی وصال کا متمنی کم ہے ، اور زندگی کو اُس کے فرسودہ شیووں سے نجات دلانے کا خواہاں زیادہ ۔ دونوں زبانوں کی شاعری نے ایسی دنیائیں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ، جن میں حُسن اور عشق کا مفہوم نیا ہو ۔ جن میں حقیقت اپنی پوری سادگی اور بے ریائی کے ساتھ جلوہ گر ہو ۔ اور جن میں انسان کی روح پورے طور پر آزاد ہو سکے ۔ دونوں زبانوں کی شاعری میں "ابہام" پایا جاتا ہے ، یعنی اُن لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں ، جن کا اپنا احساس پرانا ہے اور جنھوں نے زندگی کے نئے نئے مظاہرات سے کچھ حاصل نہیں کیا ۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے ، تفاہم کے نئے نئے راستے بھی کُھلتے جا رہے ہیں ۔

برسوں تک نیما یوشیج فارسی کے قدامت پرست شاعروں اور نقّادوں کے طعن و استہزا کا ہدف بنا رہا ، جیسے آج بھی اردو کے جدّت پسند شاعر اپنے پڑھنے والوں اور نقّادوں کی تضحیک ، بلکہ نافہمی کا شکار چلے آتے ہیں ۔ لیکن جہاں اردو میں کچھ عرصے سے

قدیم و جدید کی بحث بڑی حد تک سرد پڑ چکی ہے ، فارسی میں آج بھی یہ مسئلہ در پیش ہے کہ آیا شاعری میں کسی قسم کی تبدیلی جائز ہے یا نہیں ، اور اگر جائز ہے تو کس قسم کی ، اور کس حد تک ؟ بحث کا دوسرا موضوع یہ ہے کہ آیا شاعر کی کوئی اجتماعی ذمہ داری ہوتی ہے یا نہیں ، اور اگر ہوتی ہے تو کس حد تک اور کس شکل میں ؟ ان بحثوں کے باوجود نہ صرف نیما یوشیج کا نوجوانوں کے طبقے پر اثر روز افزوں ہے ، بلکہ جدید اور جدید تر شاعروں کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے - چنانچہ پچھلے چند برسوں میں "موجِ نو" کے نام سے جو ادبی تحریک وجود میں آئی ہے ، اُس نے نہ صرف نیما یوشیج کی روایات کو مزید تقویت دی ہے ، بلکہ جدید شاعری کو سمجھنے سمجھانے کے نئے راستے بھی پیدا کر دیے ہیں -

نیما یوشیج وہ پہلا شاعر تھا جس نے فارسی شاعری کو قافیے ، ردیف اور مروجہ عروض کی پابندیوں سے نجات دلائی - اُس نے عربی کے دیے ہوئے اوزان سے ہٹ کر ، اپنے اوزان کی بنیاد موسیقی پر رکھی ، لیکن ایرانی موسیقی پر نہیں ، بلکہ اُس موسیقی پر جسے وہ "اپنی روح کے اندر محسوس کرتا تھا" - اُس نے اپنی ہر نظم کے لیے اوزان اور قوافی نظم کے مضمون کے مطابق وضع کرنے کی کوشش کی -

نیما یوشیج اور میراجی کی زندگی اور شاعری میں کئی طرح کا تشابہ پایا جاتا ہے - لیکن جہاں میراجی اپنی ہی ذات میں گم تھا ، نیما یوشیج نے اپنی شاعری کو — ابتدائی کوششوں سے قطع نظر — اپنی قوم کی سرنوشت کا جزو بنا کر اُس کی نئی بیداری کی عکاسی کی - نیما یوشیج کو مجرّد حُسن میں کوئی دلچسپی نہ تھی ، بلکہ وہ ایک

طرح سے اجتماعی حُسن دیکھنے کا متمنی تھا۔ وہ اپنی شاعری میں مازندران کے کسانوں کی کھیتیوں کے حُسن کا ذکر جس محبت سے کرتا ہے، اس کی مثال میراجی کی شاعری میں نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے وہ شاد عارفی اور اردو کے ایک اور فراموش شدہ شاعر فاخر ہریانوی کے زیادہ قریب ہے، اور ایک حد تک حفیظ جالندھری کے ذوق و شوق سے بہرہ ور نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری میں ہمارے "ترقی پسند" شاعروں کے مانند زندگی کی نئی ترتیب و تنظیم کی خواہش تو نہیں، لیکن دردمند لوگوں کی زندگی کے مناظر اس کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔ وہ جس انداز میں کسانوں کی غم رسیدہ زندگی کے سادہ حُسن کی نقشہ کشی کرتا ہے وہ حیرت انگیز طور پر تاثر انگیز ہے۔ نیما یوشیج نے اپنے اکثر کنائے میراجی کے مانند فطرت سے اخذ کیے ہیں۔ لیکن نیما کو ان کنایوں یا علامات سے براہِ راست کم دلچسپی ہے۔ وہ بیشتر فطرت کے مناظر کے حُسن میں گم نظر آتا ہے۔ میراجی کو جو جنسی مسئلہ درپیش تھا وہ نہایت شہری قسم کا اور متمدن زندگی کا مسئلہ ہے۔ اسی مسئلے نے میراجی کی شاعری کو گویا "جنسی تصوف" کی شاعری بنا دیا تھا۔ لیکن نیما کی شاعری میں صرف سادہ دل لوگوں کے رومانوں کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ میراجی ہی کی طرح نیما کی تصویریں متحرک بلکہ ایک حد تک بے قرار نظر آتی ہیں۔ لیکن میراجی کے مقابلے میں نیما کے رنگ زیادہ شوخ و شنگ ہیں۔ میراجی نے صرف سادہ زبان کے استعمال پر اکتفا کی لیکن نیما یوشیج نے زبان میں حسبِ منشا طرح طرح کے اختراعات سے بھی کام لیا ہے۔ نیما کی شاعری میں جنسیت قریب قریب مفقود ہے، یا محض "چراغِ تہِ دامن" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بدلے اس کے ہاں رومانیت اور جمال پرستی کے عناصر

غالب ہیں۔ اُس نے اپنی شاعری کے بعض اجزا اُنیسویں صدی کے فرانسیسی شاعروں سے کسب کیے تھے اور یہ اُنھی شاعروں کا اثر تھا کہ وہ اپنی ابتدائی رومانیت کے بعد علامت پرستی کی طرف مائل ہو گیا۔ میراجی کی طرح ملارمے سے اُس نے بھی بہت کچھ پایا ہے، خاص طور پر اپنی تصویر سازی میں۔ وہ میراجی کی طرح اپنی اکثر تصویریں حیوانوں، پرندوں اور روزمرہ کی اشیا سے اخذ کرتا ہے، لیکن جہاں میراجی اشارے، کنایے اور رموز و ایہام کی مدد سے اپنی شاعری کا تار و پود تیار کرتا ہے، وہیں لیا علامت سے قطع نظر کر کے اشیا کے عینی اور مرئی اوصاف کی طرف توجہ دیتا ہے۔ اُن کے پوشیدہ اوصاف یا اُن کے پُراسرار رشتوں کا ذکر کم کرتا ہے۔ اس طرح وہ میراجی کے مقابلے میں زیادہ حقیقت نگار شاعر ہے۔ جہاں ملارمے کی شاعری میں الفاظ اور تراکیب اور مصرعوں کی ترتیب موسیقی پر مبنی ہوتی ہے اور میراجی کی شاعری میں اوزان کی قطع و برید پر، لیا شعر کی ہیئت اور تشبیہات پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اُسے الفاظ کی موسیقی سے، یا نغمہ انگیز الفاظ سے زیادہ شغف نہیں۔ بلکہ مصرعوں کی باہمی آمیزش اور گریز کے ذریعے وہ ایک طرح سے متناسب لہجہ برقرار رکھتا ہے۔ جہاں میراجی نے اپنی تمام جدتوں کے باوجود، ہندو دیومالا اور بھگتی کی تعلیم کے ذریعے ماضی کے ساتھ اپنا رشتہ بدستور قائم رکھا، لیا نے فارسی کے اُن صوفی شاعروں کی روایت سے کامل طور پر انحراف کیا ہے، جو کسی مجرد معبود کی طرف ذہنی طور پر بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جہاں میراجی نے اشارات اور ایہام کے ذریعے انسانی ذہن کے بعض پوشیدہ اسرار ہویدا کیے ہیں، وہیں لیا مرئی زندگی کے ساتھ اپنے بے لاگ انہماک کی وجہ سے ان اسرار تک پہنچنے میں قاصر رہا ہے۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیا نے زندگی کی نئی نئی تعبیروں کے امکانات ضرور روشن کیے - اشیا اور حالات کے نئے رشتے دریافت کیے - مثلاً دو نظموں "ناقوس" اور "ماخ اولا" میں (جس کا ایک پارہ اس مجموعے میں شامل ہے) وہ ایسا شاعر نظر آتا ہے جو اپنی معاشرت کے ثقافتی ورثے کو بخوبی سمجھتا ہو ، لیکن اس کی تعبیر کے لیے قدما کی لغت کا محتاج نہ ہو - نیا کا مشاہدہ ، احساس اور فکر قطعی طور پر آزاد ہے - اشیا کے بارے میں نیا یوشیج کا تجربہ میراجی سے کہیں زیادہ اجتماعی ہے - تاہم میراجی ہی کی طرح اس کے تجربے میں نئی تاثیر اور قوت ہے - نئی گہرائی ، ندرت اور گرم جوشی ہے - نیا کی نظم "ناقوس" جو اپنی طوالت کے باعث اس مجموعے میں شریک نہیں ہو سکی اور جو اس کے شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے ، ایک غم انگیز ماحول کا ذکر کرتی ہے ، لیکن اس نظم کے اندر ایک روح افزا بشارت بھی پوشیدہ ہے —— ایک نئی بیداری کی بشارت - نیا اردو کے اشتراکی شاعروں کی طرح کوئی پُرفریب تسلی نہیں دیتا - بلکہ ایک رنج و ہراس سے لبریز زندگی کا نقشہ کھینچتا ہے ، جو روایات سے اٹی پڑی ہے اور ان روایات ہی کی بدولت دکھ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے - اس کے کھینچے ہوئے نقشے سے آئندہ کی خوش آیند تصویر خود بخود اجاگر ہونے لگتی ہے ، لیکن صرف بالواسطہ - عام آدمی کے ساتھ ہمدردی اور اس کے دکھ درد میں شرکت کی خواہش کسی جدید اردو شاعر میں بہت کم ملے گی - اس لحاظ سے شاید نیا ایک طرف نظیر اکبر آبادی کے قریب نظر آتا ہے اور دوسری طرف اس کی شاعری میں احسان دانش ، مخدوم محی الدین اور مطلبی فرید آبادی کی بعض نظموں کے ساتھ اشتراک پایا جاتا ہے - اس کی نظم "ناقوس" پوری دنیا کی بیداری کی علامت ہے جس

میں نئی حرکت اور نئے نئے انقلابات سانس لے رہے ہوں ۔

بلاشبہ نیما سے پہلے ، مشروطیت کی تحریک کے پیدا کیے ہوئے شاعروں نے بھی جدّت کی ایک نئی رو تخلیق کی تھی اور اس رو کے باعث کئی قابلِ قدر شاعر وجود میں آئے تھے ، جن میں ایرج میرزا ، بہار ، عشقی ، عارف ، لاہوتی وغیرہ آج بھی مشہور ہیں ۔ ان شاعروں نے "شاعرانہ لغت" کے تصوّر کو بدل ڈالا تھا ، اور غزل کی "خود مست" شاعری کو ترک کر کے اپنے معاشرے کے نئے سیاسی رجحانات کی ترجمانی کی تھی ۔ لیکن نیما کی شاعری میں ان دو خصائص کے علاوہ آگاہی کے کئی نئے عناصر نظر آتے ہیں ۔

نئی آگاہی کے الھی عناصر کے مزید پہلو ، ہمیں **فریدون توللّی** اور مہدی اخوان ثالث (م ۔ امید) وغیرہ کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں ۔ لیکن ان دونوں شاعروں کے کلام میں انسان اور انسان کی نئی پُر ہنگامہ دنیا کا ذکر کم ہے ــــ خاص طور پر فریدون توللّی کی شاعری میں ۔ اس کی ایک آدھ نظم میں کسانوں اور مزدوروں کی حمایت کا جذبہ ضرور ملتا ہے ۔ کسان اس کے نزدیک وہ "خیرِ مطلق ہیں ، جو طاغوتی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہو" ۔ لیکن اس کی نظموں میں بیشتر ایک طرح کی نظر بازی یا اپنی نامرادیوں کا سوگ ملتا ہے ۔ اس کا ذکر و فکر اکثر نظموں میں جنسی ناکامیوں کے گرد گھومتا ہے ۔ ان نظموں میں عہدِ حاضر کی جنسیت نہیں ، بلکہ قدیم انداز کی شہوت پرستی کے عناصر غالب ہیں ۔ اس لحاظ سے فریدون توللی شاید جدید فارسی شاعری کا جوش ملیح آبادی ہے ۔ جوش ملیح آبادی کے مانند ہی وہ الفاظ کی صحت اور ان کی شان و شوکت کا قائل ہے ۔ بلکہ بعض دفعہ اس کے الفاظ اور خاص طور

اور قوافی اس قسم کی زنجیر بن جاتے ہیں ، جن کے اندر ایک بے روح جسم قید ہو ۔ اُس کی شاعری میں بھی اکثر "بورژوا" شاعروں کی مانند ایک کامل انسان کی نمود کے لیے تشویش پائی جاتی ہے ۔ اُس کی شاعری کو بعض نقّادوں نے "کتابی شاعری" کا نام دیا ہے ، جس کے اندر دستاویزوں کی سی فصاحت و بلاغت ہو ۔ تاہم وہ اپنی شاعری میں بعض دفعہ بلکہ اکثر اپنے قریب کے ، اپنے احباب اور اپنے اعزا کے ، واقعات بیان کرتے ہوئے ایک طرح کی ذاتی دلگرمی پیدا کر دیتا ہے ۔ یہ ذاتی عناصر بعض دفعہ کسی نظریاتی اخلاق فلسفے کے ساتھ مخلوط ہو جاتے ہیں ، اور اس طرح اُس کی شاعری میں ایک غیر معمولی قوت اور ایک طرح کا نرالا پن پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس مجموعے کے لیے جو نظمیں انتخاب کی گئی ہیں ان میں "مُردوں کی گلی" ایک طرح سے کہانی کی نظم ہے ۔ لیکن "مُردوں کی گلی" ایک اجتماعی علامت بن کر اس نظم کی سطح کو بلند کر دیتی ہے ۔ اس میں فریدون نے وقت کے اندر جو لچک پیدا کی ہے ، اور قبر سے ظاہر ہونے والی عورت کو جس طرح بے زمان روح بنا دیا ہے ، اس سے اُس کے نئے شعور کا اندازہ ہوتا ہے ۔ نیما یوشیج کے بعد جس شاعر کا جدید شاعروں کے طبقے پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ فریدون تولّلی تھا ۔ لیکن اب اکثر جدید شاعر اس اثر سے بھی آزاد ہو چکے ہیں ۔

فریدون تولّلی کے مانند ، مہدی اخوان ثالث (جس کا شاعرانہ نام "م ۔ اُمید" ہے) زبان کی پاکیزگی کا قائل ہے ۔ اُس کا احساس نسبتاً نیا ہے ، لیکن اُس کی زبان میں وہی ربط پایا جاتا ہے جو قدما کی زبان میں تھا ۔ مصرعوں کا پیوند ، قافیے کی عدم موجودگی کے باوجود ، اکثر وہی ہے جو غزل کی شاعری کا خاصہ تھا ۔ اُس کی شاعری میں

کئی جگہ رودکی، فردوسی اور ناصر خسرو کی جھلک ملتی ہے۔ قدیم ایران کے اساطیر سے مہدی اخوان کی آگاہی گویا عاشق کی آگاہی ہے اور قدیم ایرانی تہذیب سے اُس کا ربط ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ، اُس کے مولد و منشا صوبۂ خراسان کے عوام کی زبان اور وہاں کے مقامی شاعروں کے طرزِ بیان نے بھی اُس کی شاعری پر اثر ڈالا ہے۔ پھر وہ تمام جدید شاعروں کے مقابلے میں عربی شاعری سے زیادہ متاثر ہے اور بعض پرانے الفاظ اپنے قدیم یا متروک معنوں میں استعمال کرنے کا شائق بھی۔ کہیں کہیں اُس کی زبان خاقانی، منوچہری، عنصری اور انوری کے قصائد کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ بلکہ ان قصیدہ نگاروں کے صنائع تک اُس کی نظموں میں جھلکنے لگتے ہیں۔ جب یہ ہو تو اُس کی شاعری میں ایک طرح کی بناوٹ یا نمائش سی آجاتی ہے اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس نے یہ الفاظ قدیم لغت کی کتابوں سے نکال نکال کر سطروں میں پرو دیے تاکہ ایک وزن میں شامل ہو سکیں۔ لیکن الفاظ اور مفہوم یا فکر اور وزن میں جو قدرتی ربط ہونا چاہیے اُسے نظرانداز کر دیا۔

اپنے قول کے مطابق، مہدی اخوان صرف "مرثیہ خوانِ دلِ دیوانۂ خویش" ہے، لیکن اُس کی نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمام جدید شاعروں کے مقابلے میں اجتماع کا شعور زیادہ رکھتا ہے۔ اجتماعی موضوعات اُس کی شاعری پر چھائے ہوئے ہیں اور وہ ان موضوعات کے بارے میں اپنے خیالات کا (جذبات کا نہیں) اظہار اکثر کسی تمثیل یا قدیم روایت کے ذریعے کرتا ہے۔ وہ اپنا مطلب نہایت صریح قسم کے اشاروں میں بیان کرتا ہے۔ جہاں نیما اور دوسرے شاعر پردے کے پیچھے چھپ کر بولتے ہیں، وہاں مہدی اخوان اپنی

سیاسی طرف داری کا اظہار تک کھلے بندوں کرتا ہے ۔ اُس کے بعض اشعار گویا مقولوں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ تاہم اُس کی شاعری میں ایک بے رحم درشت واقعیت پائی جاتی ہے ۔ وہ آیندہ کے بارے میں کوئی خوش آیند تصویر پیش نہیں کرتا ، بلکہ آیندہ کو ہیچ سمجھتا ہے ۔ اُس کی نظموں میں ''شاہنامے کا آخر'' شاید اس لحاظ سے استثنا کی حیثیت رکھتی ہے ، کیونکہ اس میں ایک ''سُہانی صبح کے سنہرے جال'' کی طرف بھی اشارہ ہے ۔ اپنے دیوان ''ازین اوستا'' کے مؤخرے میں وہ لکھتا ہے : ''میری خودی اُس بیمار انسان کی خودی نہیں جو اپنے ذاتی آلام کا رونا روتا رہے ۔ بلکہ یہ خودی اُن سب انسانوں کی ہے جنھیں اجتماعی حوادث سے واسطہ پڑا ہے اور جن کی نظروں میں حالات کے نیک و بد کبھی ایک حال پر نہیں رہتے ــ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اپنی تمام عمر اور اپنا تمام وجود بلند انسانی مقاصد اور انسان اور انسانیت کی خاطر وقف کر دینا چاہیے ۔ صرف اسی طریقے سے آدمی انسان بن سکتا ہے ۔''

مہدی اخوان کی شاعری میں طنز اور تضحیک کے عناصر بھی ہیں ۔ جب وہ اپنے غم انگیز شعروں کی گھٹن کم کرنا چاہتا ہے تو اسی طنز و تضحیک سے کام لیتا ہے ۔ بعض واقعات وہ اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے آنسو اُبل پڑتے ہیں ، اور نفرت اور شرم کے مارے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ اس کے ہاں ایسی نظموں کی کمی نہیں جنھیں شعر کہنا آسان ہو ، کیونکہ اُن نظموں میں محض مضمون آرائی سے کام لیا گیا ہے ۔ نہ تو ان میں کسی واقعے کا عکس ملتا ہے ، نہ وہ ایسی تشبیہات اور تصاویر کی حامل ہوتی ہیں جو پڑھنے والے کے لیے حظ کا باعث ہوں ۔ اس کی

نظم "نماز" جو اس مجموعے میں شامل کی گئی ہے، اس کی خوبصورت نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں ایک غم آگین غنائیت ہے جو اردو میں پورے طور پر منتقل نہیں ہو سکی۔ اس نظم میں ایک ہوشیار شراب پی کر فطرت کو اس کے اصلی شکوہ میں کشف کرتا ہے اور اس سے عشق کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں ہر انسانی ذہن کے مانند وہ تعصّبات بھرے ہوئے ہیں جو اس نے بزرگوں سے ورثے میں پائے ہیں۔ اس لیے جب وہ فطرت کے روبرو ہوتا ہے تو اس صداقت اور پاکیزگی کے اثر سے محروم رہ جاتا ہے جو کسی زمانے میں انسانی ذہن کی دولت تھی۔ اس نظم کا تشکّک جدید انسان کا تشکک ہے، جو فطرت کو پردوں میں نہیں بلکہ ننگا دیکھتا اور دکھاتا ہے۔

مہدی اخوان ڈرامائی زبان استعمال کرنے کا بھی دلدادہ ہے ___ جیسے اس کی نظم "باغ اور پیوند" میں۔ کبھی اس کی زبان ماضی اور حال کے درمیان پُل بن جاتی ہے، اور اس کی تمثیلات کا رشتہ اساطیر اور مذہب سے جا ملتا ہے۔ اس کی نظم "کتیبہ" جو اس مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی، ایک مربوط سمبل ہے، جس میں گویا ایک اسطورہ بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کے کرداروں کی آرزوئیں متحجّر ہو چکی ہیں اور اپنی آرزوؤں اور امنگوں سے بے خبری کے باعث وہ خود بھی پتھر کی سلیں بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جگہ پر کروٹ تک نہیں لیتے اور کروٹ لیتے ہیں تو اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ کتیبہ ان کی مردہ آرزوؤں اور امنگوں کا شاہدِ عینی ہے۔ اس طویل استعارے کے کئی مطلب لیے جا سکتے ہیں، لیکن شاید سب سے قرینِ قیاس مفہوم یہ ہے کہ ایک دنیا اپنے ناکارہ پن

کی وجہ سے اپنی ہر کوشش کو برباد کر دیتی ہے ۔ یہ نظم انسانوں کی شکست اور تکرارِ شکست کی کہانی بیان کرتی ہے — اس زمانے کی داستان جب انسان کی قیمت گر چکی ہے اور اس کی ہر امید کا خاتمہ ہو چکا ہے ۔ یہی احساس مہدی اخوان کی نظم ”شاہنامے کا آخر“ میں بھی موجود ہے ۔ اس فکر سے اس کے گہرے ادراک کا پتہ چلتا ہے جس کی روشنی میں وہ اجتماعی اور تاریخی حالات کا مشاہدہ کرتا ہے ۔

احمد شاملو (ا ۔ بامداد) شاید فارسی کا پہلا شاعر ہے جس نے شاعری کو کامل طور پر قافیے ہی سے نہیں ، بلکہ وزن سے بھی آزاد کیا ہے ۔ اور اس آہنگ سے بھی کنارہ کشی کی ہے جس پر نیما یوشیج نے جدید فارسی شاعری کی بنیاد رکھی تھی اور جس کا قائل مہدی اخوان ثالث ہے ۔ لیکن اس کی شاعری میں شعری عناصر بکثرت ہیں ۔ اس کی نظمیں ”پریا“ ، ”ماهی“ ، ”بر سنگ فرش“ ، ”دختر های ننه دریا“ اور ”مثنویِ شبگیر“ وغیرہ وزن سے کامل طور پر آزاد ہونے کے باوجود زبان زدِ عام ہو چکی ہیں ۔ اس کی بظاہر نثر نما شاعری میں رسمی آہنگ نہیں ، بلکہ ایک شخصی آہنگ کا نادر شعور ملتا ہے ۔ اسے گویا باطنی آہنگ کہنا چاہیے ، جو الفاظ پر کم منحصر ہے ، خیالات پر زیادہ ۔ شاملو نے اس آہنگ سے اپنی نظموں میں ہیئت اور مضمون کی آمیزش کے لیے بڑا کام لیا ہے ۔

شاملو پر اکثر ہیئت پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے ۔ اس الزام سے اردو کے جدید شاعر ناواقف نہیں ۔ شاملو پر یہ الزام ایک حد تک یوں صحیح ہے کہ وہ ہیئت میں کسی تنوع کا قائل نہیں ۔ اس کی تمام شاعری یکساں آزاد ہے ۔ نیما کی طرح نہیں جو اپنے ہر مضمون

کے لیے نیا قالب ایجاد کرتا تھا۔ شاملو بعض اور جدید شاعروں کی طرح فرانسیسی شاعروں سے بے حد متأثر ہے۔ ''غزل الغزلات'' نے بھی اس کی شاعری پر اثر ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ نیما یوشیج ہی نہیں اس کی اکثر نظموں میں فریدون تولّلی اور پرویز ناتل خانلری (جس کی کوئی نظم اس مجموعے میں شریک نہیں ہو سکی) کا پرتو بھی اس کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس کے قافیے اکثر ہم شکل ہونے کی بجائے ہم صوت ہوتے ہیں۔ وہ اگرکبھی مروجہ اوزان سے کام لیتا ہے تو اکثر ایک ہی نظم کے اندر کئی اوزان شامل ہو جاتے ہیں اور بغیر کسی قابلِ جواز وجہ کے بدلتے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک ہی حرکت یا حرف کی مدد سے وہ نیا قافیہ اختراع کر لیتا ہے۔ اگرچہ اس کی شاعری میں ایک خاص قسم کا لحن موجود ہے، لیکن اس کی بعض نظمیں نثر اور نظم کے درمیان معلق نظر آتی ہیں اور بعض نظموں پر نثر کی مستقیم منطق غالب آ جاتی ہے۔ بعض دفعہ اس کی نظموں سے شعری استعارہ تک غائب ہو جاتا ہے اور یکے بعد دیگرے بے رنگ اور بے صورت تصویریں سامنے سے گذرنے لگتی ہیں۔ بعض نظمیں گویا اخبار کا اداریہ بن کر رہ گئی ہیں۔ ان نظموں کی زبان اس قدر واضح اور مستقیم ہے کہ وہ شعر کے کسی روایتی تصور پر پوری نہیں اترتیں۔ تاہم اس کی شاعری میں ایہام ہی کم نہیں، ابہام بھی کم ہے۔ دوسرے جدید شاعروں کے مقابلے میں اس کی شاعری میں احساس کی گہرائی اور رمز بھی زیادہ نہیں۔ لیکن مہدی اخوان کی طرح اس کی اہمیت بحیثیت شاعر کے یہ ہے کہ اس کا موضوع اجتماعی مسائل ہیں اور ان کے گرد اس نے ایک ذاتی فلسفے کا جال سا بُن رکھا ہے۔ مگر اس کی شاعری فکر کے ان کمیوں سے پاک ہے جو دوسروں سے اخذ کیے گئے ہوں۔ اس کی عاشقانہ نظمیں قدیم

شاعروں کی مانند محبوبہ کی جفاؤں کی یاد سے پُر ہیں ۔ لیکن اس کی عشقیہ نظموں کا پس منظر اکثر اجتماعی ہوتا ہے ۔ مختار صدیقی کی طرح اس کے مجموعے "آیدا ، درخت و خنجر و خاطرہ" کی نظمیں ان دوستوں کی یادوں سے پُر ہیں ، جو کسی مقصد کی خاطر شہید ہو گئے ۔ بعض نظموں میں وطن پرستی کے تند احساسات ہیں اور فیض کی طرح زندان کے تاثرات بھی ۔ فیض ہی کے مانند شاملو بھی جیل میں محبوبہ کی یاد اور اس کے وصل کی یادوں سے سرشار نظر آتا ہے ۔ آسی کی طرح محبوبہ کے عشق اور وطن کی محبت کے درمیان کشمکش برابر جاری رہتی ہے ۔

لیکن شاملو زبان و بیان کی بے پناہ قدرت کا مالک ہے ۔ اس کی تازہ ترین نظموں میں اس کے فکر نے بڑی وسعت پائی ہے ۔ اور بعض جگہ زبان کی ریزہ کاری ، جو پہلے بھی موجود تھی ، ترصیع کی حد تک پہنچ گئی ہے ۔ اس سے اس کی نظموں میں حظ کی ایک نئی سمت پیدا ہو گئی ہے ۔

شاملو کی نظموں میں موت کا ذکر بار بار اور مختلف رنگوں میں آتا ہے ۔ صحیح بات یہ ہے کہ جدید فارسی شاعری میں قدیم فارسی شاعری ہی کی طرح شاعروں کا موت سے انہاک خاصا ہے ۔ خاص طور پر شاملو ، نادر نادر پور اور فروغ فرخزاد کی شاعری موت کے ذکر سے پُر ہے ۔ فرق یہ ہے کہ قدیم فارسی شاعر تصوف کے بخشے ہوئے اطمینانِ قلب کی بدولت موت کو زندگی ہی کا ایک رخ سمجھتے تھے اور اسے "وصال" کہہ کر اس سے بے نیازی ہی اختیار نہیں کر لیتے تھے ، بلکہ اس کا خیر مقدم بھی کرتے تھے ۔ جدید شاعر کہیں بھی ہو "غالب کے مانند" موت اور غم کو مترادف قرار

دیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ موت نے اس کے لیے اپنی ظاہری واقعیت سے کہیں وسیع تر مفہوم پیدا کر لیا ہے اور وہ معنوی اور اجتماعی موت یا زوال کا نشان بن گئی ہے۔

اسماعیل شاہرودی کے ابتدائی مجموعے ''آخرین نبرد'' میں ، جس پر نیما یوشیج نے نہایت اچھا مگر مبالغہ قسم کا دیباچہ لکھا تھا ، اس زمانے کے سیاسی اور اجتماعی حوادث کی طرف اشارات کی فراوانی ہے اور اس میں وہ اپنے ماحول اور اس کے ذہنی اثرات کی طرف متوجہ نظر آتا ہے ۔ لیکن بعد کی نظموں میں ، جو دوسرے مجموعے ''آیندہ'' میں شائع ہوئیں یا اس کے بعد رسالوں میں ، شاہرودی نے زندگی کا مجموعی عرفان پانے کی کوشش کی ہے ۔ اس کی زبان نیما کے تتبع میں اپنے اندر بڑی تازگی رکھتی ہے اور نیما ہی کی طرح ہیئت کے نئے نئے تجربے اس کو ہمیشہ عزیز رہے ہیں ۔ بلکہ اس نے نیما سے بھی کہیں زیادہ اس امر کی طرف توجہ دی ہے ۔ مثلاً اپنی نظم ''شعرِ بے پایاں'' میں ، جس میں گھڑی کی ٹک ٹک کی تکرار بے پایاں طور پر کی گئی ہے ، یا وہ نظم جس کا عنوان ہے ''م و می در سا'' ، یہ گویا حافظ کے مصرعے ''بیا تا گل بیفشانیم (م و مے در سا) غر اندازیم'' کے ساتھ شعبدہ بازی ہے ، اس سے شاہرودی کی تکنیک کے ساتھ خالص اور بے ریب دلچسپی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ شاید اسی وجہ سے اس کی بعض نظمیں ذہنی اعجوبہ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتیں ۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ ذاتی موشگافیوں کا شاعر نہیں اور ہرچند تکنیک کی پرجوش نمائش بعض دفعہ موضوع کے خلا کی پردہ پوش بن جاتی ہے ، وہ بحیثیت مجموعی انسانی رشتوں کے جویا شاعروں میں ہے ۔ اس کا فن بنیادی طور پر سوریالیستی ہے ، لیکن اس کی نظموں

میں نہایت دلآویز موہومات کی صورت میں انسانی اور غیر انسانی حقائق کی ایک نئی ترتیب اور تعبیر ملتی ہے ۔ شاہرودی کو زندگی سے شدید وابستگی ہے ، لیکن ساتھ ہی وہ اس سے بیک وقت دوری اور نزدیکی بھی ڈھونڈتا ہے ۔ اسی طرح اس کی شاعری میں اندر کا انسان اور باہر کا انسان اور موجودہ انسان اور آنے والا انسان باہم کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں ۔ بعض دفعہ اس کی شاعری میں موجودہ انسان کی موت کی تمنا کا احساس ہوتا ہے ، تا کہ اس سے نیا انسان طلوع ہو سکے ۔ اس کے علاوہ اس کی نظموں پر ایک موہوم سا ہول چھایا رہتا ہے ۔ کبھی فطرت کا ہول ، کبھی تنہائی کا ، کبھی اپنی ذات کا ۔ اور اس ہول کے تحت انسان اور اشیا سب ایک واہمے کی دنیا میں مدغم ہو جاتے ہیں ۔ بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے الفاظ ہی کے نہیں بلکہ انسانوں اور اشیا کے بھی حصے بخرے کر دیے اور کسی کا بازو کسی کے جا لگا اور کسی کی ٹانگ کسی نے پہن لی ، اور انسانوں میں بھی محض شے ہونے کا اشتراک باقی رہ گیا ۔ اس کی بیشتر نظمیں خود کلامی کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری جذبے کی ناکامی ہے ، جس کی وجہ سے الفاظ بعض دفعہ کھلونا بن کر رہ جاتے ہیں ۔ جیسے ایڈگر ایلن پو کی نظم "گھنٹیاں" میں یا عبدالمجید بھٹی کی نظم "بہن" میں ۔ لیکن شاہرودی پھر بھی ان شاعروں میں شمار ہوتا ہے ، جنھوں نے گویا اپنی ذات کی قربانی دے کر دوسروں کے علو اور تزکیے کی خاطر شعر کہے ۔ اس کی نظموں میں انسانی صورت حال پر خاصی بے قراری پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی آئندہ کی ہلکی سی روشنی بھی ۔ اس کی زبان کنایاتی ہے لیکن اس کی نظموں میں ، ایک لطیف قسم کی فکری گہرائی اور تصویر کشی کی ندرت ملتی ہے ۔ اس کے

سوریالیستی رنگ میں شعر کہنے والوں کی تعداد خاصی ہے۔ مثلاً نصرت رحمانی، م۔ آزاد اور "موجِ نو" کے قریب قریب سب شاعر۔

انسانی صورتِ حال پر یہ بے قراری سیاوش کسرائی اور ہوشنگ ابتہاج (سایہ) کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ سیاوس کسرائی اپنی طویل نظم "آرشِ کمانگیر" کی وجہ سے مشہور ہے (اس نظم کو اس مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا ہے)۔ اس نظم کی بنیاد ایران کا ایک قدیم اسطورہ ہے، جس کی رُو سے آرش نامی تیر انداز اپنے تیر کے اندر اپنی روح بھر دیتا ہے، تاکہ روایت کے مطابق وہ زیادہ دُور تک پرواز کر سکے اور اس طرح ایران اور توران کی لڑائی میں وہ ایران کی سرحد کی نشان دہی اور آگے تک کر سکے۔ اس نظم میں زندگی کی ثنا خوانی ہے — زندگی کے حُسن اور پاکیزگی کی، اور لطیف قسم کی تلقین کہ زندگی کو قائم و دائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان خود زندگی کا خدمت گزار، بلکہ "ایندھن" بن جائے۔ لیکن اس نظم سے قطع نظر کسرائی کے ہاں بالعموم زندگی سے مایوسی پائی جاتی ہے۔ اُس کے نزدیک زندگی انحطاط کے راستے پر گامزن ہے اور جو بدی پہلے تھی، آج بھی موجود ہے اور اُس کا خاتمہ نظر نہیں آتا۔ جن نظموں میں وہ ایک حد تک آنے والے اُجالے کا منتظر یا اُس کے لیے پُراُمید دکھائی دیتا ہے، اُن سے بھی یہ کم ہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رات کون سی ہے جس کی صبح کا انتظار ہے۔ کسرائی میں زندگی کی واقعیت کی نقشہ کشی کی بڑی صلاحیت ہے، لیکن ڈاکٹر رضا براہنی کے قول کے مطابق "وہ اپنا پوزا۱ قد کبھی نہیں نکالتا"۔ اجتماعی صورتِ حال پر بھی اُس کی نظر محدود ہے — کمیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے۔ اُس کی

تصنیف ''بادماوندِ خاموش''، ''آوا''، خونِ سیاوش'' حتیٰ کہ اس کے شاہکار ''آرشِ کمانگیر'' میں بھی یہ عیب موجود ہے۔ زبان، تصاویر اور استعارے کے محدود ہونے کا احساس اُس کی ہر نظم سے ہوتا ہے۔ وہ مخصوص تصویروں اور استعاروں کی تکرار کو کافی سمجھتا ہے۔ پھر جن مضامین کو اُس نے اپنا موضوع بنایا ہے، اُن سے اُس کی قلبی وابستگی کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب کچھ بھیڑچال ہو۔ یہ موضوعات بہت کم اُس کے ذاتی تجربات کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں مضمون کے تقاضے سے بڑھ چڑھ کر تزئین و آرائش سے کام لیتا ہے۔ اُس کی شاعری میں کسی ذاتی کشاکش کا احساس بھی کم ملتا ہے۔ اُس کے جدید ہونے کا سب سے بڑا ثبوت غالباً یہ منفی حقیقت ہے کہ اُس کے ہاں قدیم تصوّف اور اُس کے پسندیدہ استعارے کامل طور پر غائب ہیں۔ اُس کا بعض دفعہ مقولوں کے سہارے شعر کہنا صائب تبریزی کی یاد دلاتا ہے۔ اُس کی بعض نظمیں محمد حسین آزاد یا حالی کی بعض نظموں کے مانند کسی اخلاقی مقولے سے شروع ہوتی اور اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ اور اردو کے انھی شاعروں کے مانند وہ جس زبان میں یہ مقولے پیش کرتا ہے وہ عوام کی نہیں بلکہ اشراف کی زبان ہوتی ہے۔ اُس کی تصنیف ''خانگی'' سے بعض نقّادوں، مثلاً محمود کیانوش نے اُس کی سہل انگاری اور جلد بازی کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اور زبان اور عروض کی غلطیوں اور پیش پا افتادہ تصویروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ کسرائی کی شاعری میں بحیثیتِ مجموعی کسی غیر معمولی فکر یا خلوص یا جوش و خروش یا نئی لسانی ہیئیت وغیرہ کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن اُس کی شاعری میں بعض ایسے عالمگیر عناصر ملتے ہیں جن کی بنیاد اخلاق پر ہو۔

اور اپنی تازہ ترین نظموں میں وہ خاص طور پر عوام اور اُن کے مسائل سے دست و گریباں نظر آتا ہے۔

ہوشنگ ابتہاج سایہ کی شاعری بظاہر سادہ عشق کی شاعری ہے، جس میں حسبِ معمول ایک مرد اور عورت مبتلا ہیں۔ یہ عشق ایک لامتناہی بیگانگی میں بدل جاتا ہے اور پھر اُس کے اس انجام پر شمعیں، بادل، راتیں، درخت، ستارے، باغ، گھاس حتیٰ کہ خود خاموشی زار و قطار روتی ہے یا رونا چاہتی ہے۔ لیکن فطرت کے قوی تر مظاہرات کے پیدا کیے ہوئے فشار کے باعث کھل کر رو نہیں سکتی۔ مثلاً صدف کے اندر آنسو، طوفانوں کے شور و غوغا کی وجہ سے دب کر رہ جاتے ہیں۔ بادل کبھی کھل کر برس نہیں سکتے۔ رات کبھی صبح میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے تو دُور دُور رہتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سایہ اب شعر کم کہتا ہے، لیکن ایک زمانے میں اُس کی شاعری کو اُن نوجوان آرزوؤں کی عکاسی جانا جاتا تھا جو دلوں کے اندر مر جاتی ہیں۔ اسی کو بعض نقادوں نے قومی یا انسانی آرزوؤں کی نارسائی کی تفسیر پر محمول کیا ہے۔ سایہ جس دنیا کی تصویر کھینچتا ہے وہ یا تو ایک صحرا ہے، جس میں ہر محنت ضائع جاتی ہے یا ایک ایسا قفس جس میں انسان ایک مجبور پرندے کی طرح قید ہے۔ یہ پرندہ اس قفس سے اُڑ جانا چاہتا ہے لیکن اُسے یہ نہیں معلوم کہ اُسے کہاں جانا چاہیے۔ اس دنیا میں ہوا کے رہ گزر میں رکھے ہوئے دیے گل ہو جاتے ہیں۔ صبحوں کے آنے میں ہمیشہ دیر ہوتی ہے اور جنگل ہمیشہ خزاں کے الاؤ میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں سایہ "ترقی پسند" شاعر سمجھا جاتا تھا اور اُس کی تنقید اور تقریظ اسی خیال کے باعث کی جاتی تھی۔

اُس زمانے کے پڑھنے والے اُس کی شاعری میں عشق اور اُس کی ناکامی کو عوام کی تقدیر کا استعارہ سمجھ کر پڑھتے تھے - اسی لیے کسرائی اور سایہ، دونوں جدید فارسی شاعری کی اہم کڑیاں ہیں، اور اُن کا شمار نصب العین کے پرستار شاعروں میں بدستور ہوتا رہے گا -

محمد زُہری جس کی دو نظمیں اس مجموعے کے لیے انتخاب کی گئی ہیں، کسرائی، شاہرودی اور احمد شاملو کا ہم سن ہے لیکن اُسے ابھی اُن جیسی شہرت حاصل نہیں ہوئی - بلکہ اتنی شہرت حاصل کرنے کے لیے بھی اُسے سالہا سال انتظار کرنا پڑا ہے - اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ ایک عرصے تک قدیم اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتا رہا اور جدید رنگ کی طرف، جس میں جدید افکار اور احساسات بھی شامل ہیں، بڑی دیر کے بعد مائل ہوا - زُہری کا پسندیدہ موضوع انسان کی کوششوں کی مضحکہ خیز بے حاصلی ہے - لیکن وہ اس نتیجے پر بظاہر روایتی اخلاقی یا فلسفیانہ تصوّرات کی بنا پر نہیں پہنچا، بلکہ موجودہ انسانی تجربے کی روشنی میں پہنچا ہے - انسان اُس کے نزدیک اس دنیا میں قید ہے اور اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اندھیرے میں گرفتار - وہ ان موضوعات پر لکھنے کے لیے اکثر مختصر افسانے کی سی فضا قائم کرتا ہے - جیسے اُس کی نظم "مٹی کا مادھو" اور اُس سے بیشتر "زائرانِ شہید" میں ہے - ان نظموں میں انسان کی بے مائگی کا ذکر مشترک ہے - لیکن دوسری نظم اُن خطرات کا ذکر بھی کرتی نظر آتی ہے اور اُس خوف و ہراس کا، جو انسان کو اپنے بلند مقاصد سے روک لیتے ہیں - ساتھ ہی اس نظم میں اہلِ مذہب کی اُمید آفرینی پر ایک ہلکی سی طنز بھی موجود ہے - اس طنز کے باوجود یا اس کی وجہ سے زہری کی نظموں میں

ایک نادر سادگی اور معصومیت پائی جاتی ہے، جو دنیا کو سیاسی یا جمالی نظر سے نہیں بلکہ خالص اخلاقی نظر سے دیکھنے کی عادی ہے۔

اسی قسم کی اخلاقیت کا مالک **سہراب سپہری** بھی ہے۔ سہراب سپہری شاعر بھی ہے اور مصوّر بھی۔ سپہری اپنے ابتدائی مجموعوں میں بیشتر نقّاش ہے، لیکن "حجمِ سبز" میں وہ فلسفی نظر آتا ہے۔ اور اس مجموعے کی نظموں میں ایک طرف احساس کی تازگی اور ندرت ملتی ہے، دوسری طرف فکر اُن کے رگ و ریشہ میں پایا جاتا ہے۔ اور اس فکر کا اظہار وہ سادہ اور پُر آہنگ اور نہایت پُرمعنی اور متناسب انداز میں کرتا ہے۔ سپہری کے فکر پر مشرق (خاص طور پر ہندو اور بودھ) فلسفے کا گہرا اثر پڑا ہے، اور اسلوبِ بیان میں جاپانی اور چینی شاعری کا پرتو تلاش کرنا آسان ہے۔ سپہری کا رشتہ دوسرے جدید شاعروں کے مقابلے میں نیما سے قریب تر ہے۔ نیما کی طرح اس نے زندگی کے حُسن، لطافت اور پاکیزگی کی حمد کہی ہے۔ سپہری کی شاعری میں وہ پراگندگی اور تضاد نہیں جو کئی اور جدید شاعروں کے کلام میں ملتا ہے۔ اس کی شاعری زندگی کی گہرائیوں اور وسعتوں کی خبر لاتی ہے۔ وہ زندگی کی سادہ حقیقتوں کے بیان کے ذریعے بعض دفعہ ماوراء الطبیعی افکار اور خیالات کی تخلیق کرتا ہے، جیسے اپنی نظم "رات" میں، جو آپ کو اس مجموعے میں ملے گی۔ اکثر جدید شاعروں میں کئی طرح کی باتیں مشترک ہیں، لیکن سپہری کی شاعری کسی اور زندہ شاعر کے مشابہ نہیں۔ اگر کسی اور جدید شاعر کی جھلک ملتی ہے تو فروغ فرخزاد کی۔ فروغ کے بھی خیالات کی نہیں، صرف اسلوبِ بیان کی۔ دونوں کی زبان سادہ اور آرائش سے پاک ہے۔ لیکن سپہری کی

13669

سادگی ایک طرح سے فریب ہے - قاری فوراً اُس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا - اُس کے افکار کی گرہ کشائی کے لیے اُس کی نظموں کو کئی بار پڑھنا پڑتا ہے - اُس کی نظموں میں کوئی پیچیدگی یا ابہام نہیں، پھر بھی الفاظ اپنی سطح پر جو معنی سُجھاتے ہیں، اصل معنی اُس سے کہیں دور ہوتے ہیں، اور پڑھنے والے کو اُن تک رسائی پانے میں کچھ وقت لگتا ہے - اُس کے مجموعے "آوارِ آفتاب" میں ایک طرح سے لفظوں کا کھیل بہت تھا - لیکن "حجمِ سبز" میں تشبیہیں اور استعارے اور رموز بڑی ندرت رکھتے ہیں - اُس کی تصویر سازی یا صورت گری میں کوئی تکلف نہیں - لیکن وہ اس دور کا شاعر ہونے کے باوجود صوفیانہ دروں بینی کا مالک ہے - اور اسی دروں بینی کی مدد سے وہ جہاں بینی کرتا ہے، اور صوفی شاعروں ہی کے مانند، انسانی محبت اور درد اُس کی شاعری کی بڑی اہم خصوصیات ہیں - اُس کی شاعری میں رومانیت اور ماورائیت کی حیرت انگیز آمیزش ہے - وہ پڑھنے والوں کو واقعیت کی دنیا سے دُور لے جاتا ہے - اُس کی نظمیں مشہودات کے ذکر سے شروع ہوتی ہیں، لیکن بہت جلد واقعیت کے پار پہنچ جاتی ہیں - پھر وہ کسی ایک مُلک یا ملّت کا ترجمان نہیں بلکہ ساری دنیا کا افسانہ گو بن جاتا ہے -

سپہری کو اجتماعی مسائل سے کوئی واسطہ نہیں - اُس کا مسئلہ فلسفی کا مسئلہ ہے - وہ اشیا کو، جیسے وہ ہیں، نہیں دیکھتا، بلکہ جیسے چاہتا ہے دیکھتا ہے - "آوارِ آفتاب" میں وہ ایک خاموش راہرو ہے جو خطرات سے بھری ہوئی دنیا سے دور اپنی راہ پر گامزن ہے اور ایک ایسے خدا کی طرف بڑھ رہا ہے جو انسانی دسترس بلکہ احساس تک سے دور ہے - دراصل سپہری کا سب سے بڑا مسئلہ

خدا ہے ۔ شروع میں خدا کی ہستی محض اُس کے ذہن کی سطح پر دکھائی دیتی ہے ، لیکن اُس کی تازہ ترین نظموں میں خدا ایک اندرونی تجربہ بن جاتا ہے ، یا شاعر کے اندرونی تجربات کے ساتھ کامل طور پر گھل مل جاتا ہے ۔ ''حجمِ سبز'' میں سپہری کی توجہ مرکزی مابعد الطبیعی مسائل کی طرف بدستور ہے ، لیکن اس مجموعے کی اور بعد کی نظموں میں واقعیت سے اُس کی غفلت کسی قدر کم ہوتی نظر آتی ہے ۔ بعض نظموں میں وہ روزمرہ کے کاروبار ، اپنے ماں باپ اور دوسرے لوگوں کی طرف بھی اشارے کرتا ہے ـــــ مثلاً ''صدائے پائے آب'' میں (جو اپنی طوالت کے باعث اس مجموعے میں شامل نہیں کی جا سکی) وہ موجودہ زندگی کے حقارت آمیز پہلوؤں کی داستانیں بیان کرتا ہے ۔ ''حجمِ سبز'' میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس نہایت دقیق رمز و کنایہ کے ساتھ بیان ہوا ہے ۔ ان نظموں میں بھی اُس کا زینہ عشق ہے جس کے سہارے وہ بامِ ملکوت تک پہنچنا چاہتا ہے ۔ سپہری کی نظموں میں ابدی سے جنگ کے عناصر اُن کو اخلاق تار و پود بخشتے ہیں ، تاہم زندگی اُس کے نزدیک اپنی تمام تر خشونت کے باوجود تاریکی سے لبریز نہیں اور موت انسان کے تعاقب میں نہیں ۔ اُس کی ان نظموں میں زندگی کا ہنگامہ موجود ہے لیکن نہایت نرم رو ۔ ان میں آج کل کی پریشانیوں اور مظالم اور فساد کا کوئی ذکر نہیں ۔ اُس کی نظموں سے جو انسانی تصویر اُبھرتی ہے وہ ایک محبت سے پُر ، محنتی اور دوست دارِ انسان کی تصویر ہے ، جو قید میں روشنی اور آزادی کے لیے کوشاں ہے اور جسے زندان سے باہر کی موسیقی اور قہقہے برابر سنائی دیتے ہیں ۔ دنیا کی ہر چیز اُس کی نظروں میں ملائم ، پاک اور بے خطر ہے ۔ اس تصوّر نے اُس کی شاعری میں پاکیزگی ، صفائی اور خوش بینی

کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے - وہ زندگی کے ساتھ عشق کی عارفانہ لذت میں گم ہے اور اس دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں جس میں بھوک اور ننگ کارفرما ہیں -

نادر نادرپور کی شاعری میں سہراب سپہری کی طرح زندگی کے بندھنوں سے گریز تو نہیں لیکن زندگی کے درشت حقائق سے بے اعتنائی ضرور ہے - وہ جہاں ایک طرف نئے احساس اور شعور کا مالک ہے، وہیں اس نے فارسی کی قدیم شاعری کی محبوب اقدار سے بھی حصۂ وافر پایا ہے - اس کی شاعری میں عام غزل گو کی تکرار یا ابتذال نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر شعر کہتا ہے - زندگی کی جو تعبیر اس نے کی ہے اس میں خاصا ابتکار پایا جاتا ہے اور اس کے استعارے تک ذاتی یا "اصیل" ہیں - اس کی بیشتر نظمیں مقفی ہیں اور ہر چند مصرعے کہیں کہیں حسبِ منشا کوتاہ و دراز ہو جاتے ہیں، لیکن وزن سے خارج نہیں ہوتے - اس کی زبان اپنی صحت کے لحاظ سے اور اس کا بیان اپنے منطقی اسلوب کے اعتبار سے احمد ندیم قاسمی کے اسلوب کے مانند خاص متانت کا حامل ہے - لیکن اس کی شاعری میں زندگی کا کوئی گہرا اور پُرخلوص درد نہیں ملتا - صرف فطرت کا تماشا اس کے لیے دلکش ہے - وہ بنیادی طور پر تصویر ساز شاعر ہے، لیکن اس کی تصویروں کے رنگ ہمیشہ دھیمے ہوتے ہیں، نیما کی طرح شوخ و شنگ نہیں - بعض نظموں میں وہ نفسیاتی نکات بیان کرنے میں بڑی چیرہ دستی سے کام لیتا ہے - وہ خوبصورت لفظوں کی تلاش میں بھی بڑی کد و کاوش کرتا ہے، بلکہ بعض دفعہ لفظ کی خوبصورتی اس کی ضرورتِ محض پر غالب آ جاتی ہے، اور یہ خوبصورت الفاظ کانچ کے شیشے بن کر رہ جاتے ہیں - وہ

اپنی بعض نظموں میں ضرورت سے زیادہ جذباتی نظر آتا ہے ، بلکہ اُس پر رقّت سی طاری ہو جاتی ہے ۔ جہاں جذباتیت ذرا کم ہو وہاں وہ جھوٹی زبان کی بجائے نہایت نازک قسم کی تصویر گری سے کام لیتا ہے ۔

نادر نادر پور کی اکثر تصویریں فیض کی تصویروں کے مانند اپنے اندر ندرت اور تازگی رکھتی ہیں — گو فیض ہی کی طرح اُس کے ہاں بھی کلیشوں کا استعمال خاصا ہے ۔ اُس کے موضوعات انفرادی ہیں ، وہ اجتماعی وسعت اپنے اندر کم رکھتے ہیں ۔ اُس کے پسندیدہ موضوعوں میں ایک موضوع "موت" کا ہے ، جس کی تکرار اُس کی نظموں میں احمد شاملو کی نظموں کے مانند بارہا ہوئی ہے ۔ لیکن یہ موت کسی ناامیدی کا نتیجہ نہیں ، نہ کسی وحشت یا ہیجان کا ۔ بلکہ ایک نازک اور میٹھی موت ہے جو زندگی میں رچی بسی ہے ۔ جہاں کہیں حُسن پایا جائے ، موت بھی وہاں پہنچ جاتی ہے ۔ نادر پور کا دوسرا موضوع عشق ہے ، لیکن اس عشق میں قدیم شاعروں کے عشق کی طرح کوئی تصوّف یا عرفان کا پہلو نہیں ۔ نہ اس میں موجودہ زمانے ہی کا کوئی درد پنہاں ہے ۔ یہ خالص جسمانی اور ارضی عشق ہے ، جو رومانیت کی حدوں سے آگے نہیں بڑھتا ۔ اختر شیرانی کی طرح ایک خیالی تصویر شاعر کو عمر بھر اپنی جستجو میں مبتلا رکھتی ہے ، ایک ایسی جستجو جس کا بظاہر کوئی انجام نہیں ۔ اصل چیز جو نادر پور کو ممتاز کرتی ہے وہ اُس کا خالص ذاتی احساس ہے اور اُس کا نہایت متنوع بیان ۔ اختر شیرانی ہی کی طرح اُس کی شاعری فکر سے خالی ہے ، اور جتنا سنجیدہ فکر ہے وہ بھی بیشتر اُس ایک خیالی تصویر کے گرد گھوم پھر کر رہ جاتا ہے ۔

کچھ عرصے سے نادر نادر پور نے ایسی نظمیں لکھنی شروع کی ہیں ، جن میں ایک طرف حالاتِ حاضرہ کے کنایات ملتے ہیں — مثلاً "آسمان سے ریسمان تک" میں — اور اس طرح وہ موجودہ زمانے کے مظالم اور آلام کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ دوسری طرف ان نظموں میں وہ نہ صرف تصاویر کو باہم متوازن کرتا ہے بلکہ ایسی تصاویر بھی پیدا کرتا ہے جو موسیقی کے سُروں کی طرح باہم پیوست رہیں ۔ اس طرح متنوع تصویروں کے باوجود ، اُس کی نظموں میں ایک ہی احساس یا فکر مجسّم ہو جاتا ہے ۔

ظرافت اور خوف کو مخلوط کر کے نئی نئی تصویریں ایجاد کرنا نصرت رحمانی (جن کی کوئی نظم اس مجموعے میں شامل نہیں) کا خاص فن ہے ۔ اُس کی بیشتر نظمیں خود کلامی ہیں اور اُس کا تخیّل ایک طرح سے نٹ کھٹ بچے کا تخیّل ہے ، اور بچے ہی کے مانند اُس کی شاعری میں تکرار کی لٹک ہے ۔ لیکن اس بچے کے اندر ایک لا اُبالی مجذوب کی روح جھانکتی ہے جس سے اُس بچے کا قد ضرور بڑا ہو جاتا ہے لیکن ذہن نہیں ۔ اُس کی بعض نظموں کا انداز گویا ذاتی اعتراف کا سا انداز ہے اور اُس کے مصرعے ابتذال اور خوش ذوقی ، ہُرگوئی اور فصیحانہ پابندیِ قواعد اور دلجمعی اور تذبذب کے درمیان جھولتے چلے جاتے ہیں ۔ نصرت رحمانی شروع شروع میں رومانی شاعر سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اس نام نہاد رومانیت کے آثار اُس کی شاعری میں بکھرے ہوئے ہیں ۔ لیکن اب اُس کی توجہ انسان کے انفرادی اور مجموعی کرب کی طرف زیادہ ہے ۔ وہ تہران کے عوام کے لہجے (زبان نہیں) اور اُن کے طرزِ بیان سے بڑا فائدہ اٹھاتا ہے اور اسی وجہ سے اُس کی شاعری بعض دفعہ تفنّن کا پہلو اختیار کر لیتی ہے ۔ زندگی کے

جن تلخ و تاریک حقائق کی طرف وہ اشارہ کر رہا ہوتا ہے ، ان کی خشونت پڑھنے والے کے لیے کم ہو جاتی ہے ۔ بنیادی طور پر وہ زندگی کی وحشی گری کا عکاس ہے ۔ وہ بظاہر روزمرہ کی اشیا اور واقعات کا ذکر کرتا ہے ، جو ایک حد تک سطحی معلوم ہوتا ہے ، لیکن اس کے نیچے ایک زبردست لاوا کھول رہا ہوتا ہے ۔ زندگی کی جو تصویر وہ کھینچتا ہے وہ ایک غولِ بیابانی کی تصویر ہے ۔ لیکن یہ غول اتنا مضحکہ خیز ہوتا ہے کہ نصرت کے اس پر قہقہے اسے کم مایہ بنا کر رکھ دیتے ہیں ۔ نصرت رحمانی اُن شاعروں میں ہے جو روایتی فکر اور اظہار دونوں سے کامل طور پر آزاد ہیں ۔ اس کی شاعری میں کسی قسم کی زیبائش اور آرائش نہیں ۔ اس کی شاعری نفرت اور غصے سے بھی پاک ہے ۔ وہ اُن مسائل کا ذکر کرتا ہے جو ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں ، لیکن اپنی اسی عمومیت کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہتے ہیں ۔ وہ اُن پر اپنی بصیرت کی کرنیں ڈال کر انھیں ہمارے سامنے اجاگر کر دیتا ہے ۔ اس کی شاعری اس انسان کی داستان بیان کرتی ہے جو اپنی خوش اعتقادی اور شرافت کے باعث دکھ سہتا چلا جاتا ہے اور پھر نہایت خلوص کے ساتھ اس دکھ کا رونا بھی رونے لگتا ہے ۔ نصرت کی شاعری میں کسی قسم کی کشمکش نہیں ملتی ، بلکہ اس میں ایک ایسے آدمی کی باتیں سنائی دیتی ہیں جو دن بھر کے واقعات سے لطیف ترین واقعات چُن چُن کر دوستوں کی محفل میں اُن کی خوشنودی اور حیرت کے لیے دہراتا چلا جائے ۔ لیکن اس تمام گفتگو میں شاعر کو اپنے ماحول کے غیر انسانی ہونے کا احساس برابر رہتا ہے ، جس میں انسان کی نہیں ، اشیا کی پرستش ہوتی ہے ۔ لہذا اشیا کے ساتھ نصرت کی کدورت باقی رہتی ہے ۔ ان اشیا کو وہ ہنسی ہنسی میں نگل جانا چاہتا ہے ۔ وہ ان اشیا کو

نگل کر اپنا پیٹ نہیں بھرنا چاہتا ، بلکہ مداری کی طرح صرف دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہے ، یا اس طرح ان اشیا کا وجود مٹا دینا چاہتا ہے ۔ نصرت کے اندر ایک حادثہ ُجو کی وہ روح ہے جو متواتر آزاد ہونا چاہتی ہے ۔ نصرت کی شاعری اس بات کی معرفت ہے کہ انسان اپنے انا کی تمام لاف زنی کے باوجود کسی فوقیت یا شرف کا اہل نہیں ۔ اور گویا ہم سب اپنے ہی خوابوں کے محض حواشی ہیں ۔

نصرت کے مقابلے میں منوچہر آتشی جس قوت اور توانائی کا مالک ہے ، وہ جدید فارسی شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے ۔ وہ اپنے حواس کے براہِ راست تجربے کی روشنی میں شعر کہتا ہے ۔ اُس کی شاعری میں نہ صرف قدیم تصّوف کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی ، بلکہ اُس پر فرانسیسی شاعری کا پرتو بھی نہیں پڑا ۔ اُس کے ہاں نادر موضوعات کی فراوانی ہے ۔ اُس کا تخیّل وحشی عناصر سے پُر ہے ۔ اور وہ اُن کے لیے گویا رومانی کشش رکھتا ہے ۔ آتشی ، تمثیل کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا ، بلکہ وہ صرف فطرت کی تند و تیز ، متحرک طاقتوں کا ثناخواں ہے ۔ اس لحاظ سے وہ نیما سے زیادہ قریب ہے ۔ اُس کی شاعری پر سمندر کی ہیبت ، جنگلی جانوروں کی وحشت ، ریت کی درشتی اور بندرگاہوں کا شور و غوغا چھایا ہوا ہے ۔ صرف کہیں کہیں وہ اُنہیں تمثیل کے طور پر استعمال کرتا ہے اور پھر اُن سے اجتماعی ، تاریخی یا تمدنی معانی تخلیق کرتا ہے ۔ آتشی اُن چند شاعروں میں سے ہے جنہیں جہاں بینی ودیعت کی گئی ہے ۔ اُس کی جہاں بینی کا سرچشمہ یہی فطرت کے وحشی اور درشت مظاہرات ہیں ۔ اُس کی نگاہیں اشیا کے ظاہر و باطن کی ہیمیت کو دیکھتی ہیں

اور وہ اُس بہیمیت کے ساتھ عشق کرنے لگتا ہے ۔ اُس کا عشق عناصرِ اربعہ پر محیط ہے ۔ اُس کے نزدیک فطرت کی تمام خوبصورتی اُس کی خشونت اور اُس کی متحرک قوت پر منحصر ہے ۔ آتشی کا مشاہدہ حیرت انگیز ہے ۔ مثلاً جب وہ گھوڑوں کا ذکر کرتا ہے ، جیسے اپنی نظم ”خنجر ھا ، بوسہ ھا ، پیمانہا“ میں (جو اس مجموعے میں شریک نہیں کی جا سکی) تو اُن کے طرح طرح کے خصائص اُس کے حافظے کی گہرائیوں سے باہر نکلتے چلے آتے ہیں ۔ صرف گھوڑوں ہی کا ذکر نہیں ، وہ اپنے تمام ماحول اور اس کی سب اشیا کی عکاسی میں بڑی ندرت اور ذکاوت سے کام لیتا ہے ۔ آتشی ایک طرح سے بدوی شاعر ہے ۔ وہ بدوی شاعروں کا سا ذہن اور ہنر رکھتا ہے ۔ یہ نہیں کہ اُس کی شاعری میں متمدن انسان کے فکری اور ذہنی عناصر نہ ہوں ، یا اسے تزئین کا فن نہ آتا ہو ، لیکن وہ جمال کی بجائے جلال کا شاعر ہے ۔ اس کی شاعری میں تغزل کا غنا مفقود ہے ۔ جہاں کہیں اس نے تغزل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ، وہیں ایک طرح کا ابتذال پیدا ہو گیا ہے ۔ عورت سے عشق اس کی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتا ۔ اگر عشق ہے تو گھوڑوں سے ، وحشی جانوروں سے ، سمندر کے شور و غل سے ۔ بعض نقادوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آتشی کی شاعری میں عینیت کی کمی ہے ، اور وہ صرف واقعیت پرست شاعر بن کر رہ گیا ہے ۔ لیکن اپنی بعض نظموں میں ، مثلاً ”جنھوں نے سوت کو ڈھال . . .“ (جو اس مجموعے میں موجود ہے) جہاں وہ زمین اور ہلوں اور درانتیوں کا ذکر کرتا ہے ، اس کی شاعری میں ایک طرح سے عینیت خود بخود نمودار ہونے لگتی ہے ۔ اور اس کی طویل نظم ”خنجر ھا ، بوسہ ھا ، پیمانہا“ میں تو ایک طرح کی اخلاقی عینیت صاف طور پر نمایاں ہے ۔ آتشی

اپنے بارے میں لکھتا ہے : "میں ایک شہر کا رہنے والا دیہاتی ہوں۔ میری شاعری بیشتر میری جلاوطنی کی فریاد ہے — ایک ہرن کی غربت کی فریاد جو وادیوں اور جنگلوں میں گھومنے کی بجائے شہر کے کسی چڑیا گھر کے پنجروں میں بند ہو۔ یہی فریاد گاہے تمام غربت زدوں اور ستم رسیدوں کی پکار بھی بن جاتی ہے۔" تکنیک کے نقطۂ نظر سے بعض نقادوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آتشی کی نظمیں اکثر "اتحاد" سے عاری ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ اپنے مرکز سے گریزاں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ صرف آتشی ہی پر منحصر نہیں، تمام جدید شاعری ایک طرح سے مرکز سے گریز کا ثبوت دیتی ہے۔ اس کے باوجود جب آتشی کے لحنِ کلام کی حیرت انگیز قوت پر نظر ڈالی جائے تو اس قسم کے اعتراضات خود بخود صرف نظر ہو جاتے ہیں۔

جیسے نیما اور آتشی نے سمندر کے بارے میں نظمیں کہی ہیں، اسی طرح ایک اور شاعر ید اللہ رؤیائی نے سمندر کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کا مجموعہ "شعرھای دریائی" سمندر کے بارے میں نظموں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں سمندر کا حسن، اس کا نور، اس کی لطافتیں اور اس کی تمام درشتی آنکھوں کے سامنے پھیل جاتی ہے۔ رؤیائی سمندر کو پوری زندگی کی ہمہ رنگ علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے فکر اور احساس کو سمندر کے ساتھ اور اس سے بڑے پیمانے پر پوری زندگی کے ساتھ، گفتگو کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ یہ گفتگو گویا زندگی اور اپنی ذات کے انکشاف کا بہانہ ہے۔ اس بہانے سے رؤیائی عشق، زندگی اور معاشرے کے پیدا کیے ہوئے سلاسل سے آزادی کی لذت کا اظہار کرتا ہے۔ اس مجموعے

میں امواج اور ساحل کی مجرد تصویریں بھی ہیں اور عشق اور محبوبہ اور دوسرے لوگوں کے بارے میں شاعر کے افکار اور احساسات کی ترجمانی بھی۔ سمندر، یعنی زندگی، سب صداؤں کا مخزن ہے اور شاعر خود کو سمندر کی ہنگامہ پرور موجوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ گویا سمندر فطرت کی سادگی اور عریانی کے اندر پناہ لینے کا ذریعہ اور اس زندگی سے فرار کا بہانہ ہو، جس میں آلات کی فراوانی نے انسان سے اس کی تمام مسرت چھین لی ہے اور انسان کو مردہ دلی اور مایوسی کے حوالے کر دیا ہے۔ رؤیائی اپنے فکر اور فن میں ایک حد تک آندرے ژید سے اور اس سے کہیں زیادہ سین ژاں پرس سے متاثر نظر آتا ہے۔ اور ساتھ ہی، عجیب بات یہ ہے کہ، اس نے قدیم فارسی شاعروں کے فلسفۂ تصوف سے بھی بہت کچھ اکتساب کیا ہے۔ رؤیائی بنیادی طور پر اجتماعی شاعر نہیں، بلکہ انفرادی اور داخلی شاعر ہے۔ اس کا مقصد اجتماعی تصورات پیش کرنا یا ان کا محاکمہ کرنا نہیں۔ بلکہ اپنے محسوسات — نازک سے نازک تر محسوسات — پیش کرنا ہے۔ صرف کہیں کہیں رمز اور اشارے کے ذریعے وہ رنگارنگ اجتماعی تصورات کا ذکر بھی کرتا ہے لیکن اجتماعی بندھنوں سے فرار اور آزادی کی خواہش اس کی تمام شاعری پر محیط ہے (اجتماعی ذمہ داریوں سے گریز کی خواہش نہیں) اور اس کی تکرار اس کے مجموعے "دل تنگی ہا" میں بھی ہوئی ہے۔

رؤیائی کی شاعری میں اکثر مقامات پر مذہب اور مذہبی افسانوں یا اساطیر کی تلمیحات ملتی ہیں۔ لیکن اس کا مقصد کہانیاں بیان کرنا نہیں ہوتا۔ اس کی تکنیک یہ ہے کہ صرف بکھری ہوئی تصویروں کے ذریعے اس واقعیت کا نقشہ پیش کر دیا جائے جس سے

قرار مطلوب ہو۔ اس کی تصویریں ایک دوسری سے پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں، متوازی نہیں چلتیں۔ اور اس طرح پوری نظم ایک مجسمے کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ اس کے فن کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے دل کے ہیجانوں کی تفصیل میں نہیں جاتا اور بات لمبی نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ چند اشاروں میں بہت سی باتیں کہہ جاتا ہے جس سے اس کی قدرت اور قوت کی تاثیر اور بڑھ جاتی ہے۔ اس کی شاعری میں مختصر گوئی اور ایجاز اعتدال سے بھی زیادہ ہے، جس کی وجہ سے پڑھنے والا بآسانی اس کے مفہوم تک نہیں پہنچتا۔ اور باوجود اس کے کہ اس کی تصویریں بے حد خوبصورت ہیں، صرف کہیں کہیں الفاظ کی شعبدہ گری بن کر رہ جاتی ہیں —— جیسے شاہرودی یا نصرت رحمانی کی شاعری میں۔ اس کی اکثر نظمیں چند مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں —— گو بعض خاصی طویل بھی ہیں۔ اس کی شاعری میں قافیے اور وزن کے کامل فقدان کے باوجود بڑی غنائیت ہے۔ وہ ہر نظم کے لیے ایک خاص فضا اور خاص قالب تعمیر کرتا ہے اور تشبیہوں اور استعاروں میں بڑی جدت سے کام لیتا ہے۔ بعض نظموں میں، خاص طور پر "دلتنگی ہا" کی نظموں میں، جنسی تصویریں اور اشارے بھی ملتے ہیں۔ لیکن جنسیت رؤیائی کا موضوع نہیں اور اس سے براہ راست اسے غرض نہیں۔ اس کی تصویریں سب کی سب بدیع یا طبع زاد ہیں۔ اس کے الفاظ میں عجیب و غریب ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس کے کنایے عقلی اور مجرد ہوتے ہیں۔ اور ہر مصرعے میں نظم کے پوشیدہ غم کے باوجود مسرت جھلکتی ہے۔ اس کی شاعری میں اپنی ذات یا اپنے گرد و پیش کا ذکر بہت کم ہے۔ وہ عموماً ایسی چیزوں کا انتخاب کرتا ہے جو ناقابلِ لمس ہوں۔ لیکن اس کی قدرت اس

بات میں مضمر ہے کہ وہ ان تمام اشیا کو ایک ذہنی صورت بخش دیتا ہے اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ گویا یہ سب کچھ اسی سے متعلق ہے۔

بے درپے بے ربط اشیا، بے ربط الفاظ کے ذریعے جمع ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن نظم کے آخر تک پہنچ کر یک دم اس خوبصورت نقشے کا احساس جاگ اٹھتا ہے جو نظم نے پیدا کیا۔ م۔ آزاد کے فن کی یہ خاص انفرادیت ہے۔ آزاد ان شاعروں میں ہے جو اپنے اجتماعی شعور کو اپنے نفس میں ڈبو کر ایک ایسی چیز تخلیق کر دیتے ہیں جو محض عقلی نہیں رہتی، یا جسے علمی مسئلہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آزاد کی شاعری پر احمد شاملو اور فروغ فرخزاد اور ایک حد تک نصرت رحمانی کے فن کے پرتو کو دریافت کرنا مشکل نہیں۔ خاص طور پر بے ربطی میں سے ایک خوبصورت ربط پیدا کرنے کا جو فن آزاد نے نکالا ہے اس کی ابتدائی شکلیں انہی شاعروں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ آزاد کی زبان بے حد آسان اور ایک حد تک "عوامی" بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس پر ابہام کا الزام لگایا گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے استعاروں اور تمثیلوں میں بڑی ندرت ہے، اور اکثر عام پڑھنے والے کے لیے نامانوس ہوتی ہیں۔ آزاد، شروع میں فریدون تولّلی کی ترکیب بندی کے طلسم میں گرفتار رہا، لیکن "قصیدہ بلند باد" اور "آئینہ ھا تہی است" میں تولّلی کا اثر باقی نہیں رہا۔ ان دونوں مجموعوں میں نازک سوریالیستی تصویروں کی بھرمار ہے اور بظاہر سادہ الفاظ کے ذریعے گہرے فکر یا احساس کا اظہار عام ہے۔ آزاد کی تصویروں میں نزاکت کے علاوہ پاکیزگی اور معصومیت پائی جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ

فارسی غزل کا جوش و خروش اور بصیرت بھی ۔ آزاد کی شاعری ایک ایسے پرستار کی شاعری ہے جو زندگی کے ساتھ اپنے رابطے کی وجہ سے ہمیشہ شاد و خرّم رہے ۔ اور اپنے ذوق و شوق ، کیف و انبساط اور یک جہتی کی بنا پر زندگی کی سب "تقصیریں" معاف کرتا چلا جائے ۔ سہراب سپہری کے مانند آزاد بھی زندگی کے ساتھ ، اشیا کے ساتھ اور انسانوں کے ساتھ انسانوں کی ہم آہنگی کا جویا ہے اور اسی کا نغمہ سرا ہے ۔ ہرچند اس کی شاعری میں اجتماعی نا انصافیوں کی طرف اشارات کی کمی نہیں ، لیکن اس کا سب سے بڑا محرک زندگی کی وہ تقدیس ہے جس کا وہ پرستار نظر آتا ہے ۔ اس کی شاعری بحیثیتِ مجموعی زندگی کے آئینے میں انسان کا دھندلایا ہوا چہرہ دیکھنا اور اس کے مزے لینا ہے ۔

اس کے برعکس فروغ فرخ زاد کی شاعری زیادہ متین ہے ۔ فروغ کے موضوع عشق ، حسن اور موت ہیں ۔ یہ سب مضامین عورت کے چہرے کے گرد گھومتے ہیں جو خود اس کا اپنا چہرہ ہے ۔ خانلری کے قول کے مطابق "حسن اس چہرے کی صفت ، عشق اس کا خمیر اور موت اس کی تقدیر ہے"۔ اس جوانا مرگ شاعرہ کی شاعری کے بارے میں اس کی اپنی رائے یہ تھی : "میرے خیال میں ہر فن کا مقصد ایک طرح سے زندگی کو بیان کرنا ہے اور اس کی نئے سرے سے تعبیر کرنا" ۔ اس نئی تعبیر کے لیے فروغ نے عورت کو منتخب کیا ۔ وہ اپنی شاعری میں عورت کے دل کے وہ اسرار بیان کرتی ہے جو خود عورت کی زبان پر کم آتے ہیں اور مرد جنھیں اکثر صرف نظر کر دیتے ہیں ۔ اس کی عاشقانہ "مثنویوں" سے رومی کی سانسوں کی خوشبو آتی ہے ۔ یعنی ہرچند اس کا عشق نہایت ارضی عشق ہے لیکن

اس میں روحی کے عرفانی عشق کا سا ہیجان اور التہاب پایا جاتا ہے۔ روحی ہی کی طرح اس کی کوشش یہ ہے کہ زندگی کو غم اور غصے سے پاک کر کے، اسے نیا شکوہ و جلال بخشا جائے۔ وہ اپنے "گناہوں" کا ذکر نہایت جسارت اور معصومیت کے ساتھ کرتی ہے۔ لیکن اس کا نصب العین ایک حد تک اختر شیرانی ہی کے مانند ایک پاکیزہ زندگی کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔

لیکن فروغ کی شاعری میں وہ عظیم عشق نہیں جو صرف ناکامی پر منتج ہو اور ناکامی ہی سے اپنی عظمت یا جاودانی زندگی پائے۔ وہ عشق بھی نہیں جو کسی نادیدہ محبوب کی نارسا طلب میں کھو جائے۔ بلکہ وہ اس عشق کی طالب ہے جو خود دائم ہو اور جو اس کا محافظ اور امین بن سکے۔ جو اسے وقتی ہوس ناکی سے باز رکھ سکے۔ لیکن دوسری طرف یہ وقتی ہوس ناکی اپنی شدت اور حدت میں کسی طرح عظیم عشق سے کم نہیں۔ عشق بھی ایک دن ختم ہو جاتا ہے اور ہوس بھی۔ اسی لیے وہی لمحے غنیمت ہیں جن میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو مرغوب ہو۔ کیونکہ بعد میں آنے والے لمحے شاید کبھی ان لمحوں کے مانند نہ ہوں۔ فروغ کے نزدیک عشق پوری مفاہمت یا کامل شناسائی کا نام نہیں، کیونکہ جب دو ہستیاں ایک دوسری کو پورے طور پر پہچان لیں اور پھر ایک دوسرے کی ذات کی گہرائی تک پہنچ جائیں تو وہ ایک دوسرے کے لیے بے جان لاشے رہ جاتی ہیں ــــ اور دو لاشوں کا باہم عشق کر سکنا معلوم۔ فروغ کے پہلے تین مجموعے ("اسیر"، "دیوار" "عصیان") بیشتر بچپن کی، بچپن کے عشق کی یادوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور ان میں شاعرہ کی مثال "اس رند کی ہے جو شراب کا رسیا بن سکتا ہو۔ لیکن

نہ بنے اور آخر تک اپنی اولین بادہ گساری کے مزے کو نہ بھلا پائے"۔ لیکن آخری مجموعے "تولدے دیگر" میں اور اس کے بعد کے متفرق کلام میں فروغ کا عشق نئے ابعاد میں داخل ہوتا ہے۔ اب یہ صرف ذات کا عشق نہیں، گذرے ہوئے دنوں کی سرمستی کا عشق نہیں، بلکہ انسان کا عشق ہے، سچے فن کا، سچی شاعری کا۔

تاہم فروغ کی شاعری مجموعی طور پر فکری شاعری نہیں۔ لیکن فروغ کو زندگی کے حسن کے ساتھ جو گہرا عشق ہے، وہ کم ہی کسی اور جدید فارسی شاعر کو نصیب ہوا ہے ــــ اگرچہ فروغ کے نقال اب بھی بہت موجود ہیں۔ فروغ کی زندگی سے دلچسپی اور اس کی لگن گویا ویسی ہی دلچسپی اور لگن ہے جیسی بچوں کو اپنے کھلونوں سے ہوتی ہے۔ وہ بچوں کے مانند روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ذکر کرتی ہے۔ اس کی سادگی سے بعض دفعہ یہ محسوس ہوتا ہے گویا وہ آگہی سے ڈرتی ہو۔ جیسے اس کے نزدیک آگہی ہی ہر حسرت اور ناکامی کا راز ہو۔ اس کا عشق اکثر ہا و ہو سے شروع ہوتا ہے، لیکن فطرت کے سامنے مؤدبانہ سکوت اور تسلیم پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی نظموں میں جنسیت بھی فطرت کے ایک مظاہرے سے زیادہ نہیں۔ وہ عمر بھر بے اعتنائی کے ملال میں روتی رہی، لیکن آخر کار اس کا عشق فطرت کے اندر تحلیل ہو کر رہ گیا۔ اس کی شاعری کا بڑا حصہ یادوں کی تجدید بھی ہے اور ان سے گریز بھی۔ اس کی نظموں میں بارہا ماں باپ، بہن بھائی کا ذکر آتا ہے لیکن وہ ان کے درمیان بھی منفرد اور تنہا نظر آتی ہے۔ اس کے نزدیک نہ صرف رشتے ناتے بلکہ مذہب، فلسفہ اور انسانی آرزوئیں تک سب کم مایہ ہیں۔

اپنے پہلے تین مجموعوں میں فروغ اُس انسان کی تلاش میں ہے جس نے ابھی تک قالب اختیار نہیں کیا ۔ ''اسیر'' میں خاص طور پر ایک عورت کا (سب عورتوں کا نہیں) آہ و نالہ سنائی دیتا ہے ۔ آزادی کے لیے اُس کی پکار سنائی دیتی ہے ۔ ایک ایسی عورت کی پکار جو گھر کے دھندوں میں گھری ہو اور اُن مجبوریوں سے گھبرا کر بھاگ اٹھے ۔ ''دیوار'' اور ''عصیان'' میں فروغ ، خیام کی طرح دنیا کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے ، لیکن ان دونوں مجموعوں میں وہ صاف طور پر اپنے معاشرے سے بالاتر نظر آتی ہے ــــ ایک ایسی ہستی جو فکر نہیں ، احساس کی بلندیوں سے دنیا کو دیکھ رہی ہو ۔ ان مجموعوں میں تمام مروجہ عقاید کے خلاف تند و تیز آوازے سنائی دیتے ہیں ، بلکہ خود آفرینش کے خلاف احتجاج بھی ۔ ''تولدی دیگر'' کی نظمیں البتہ زیادہ پختگی کی حامل ہیں ۔ اُن میں کہیں زیادہ تحمل ہے ، اور اُن میں شاعرہ نے جس درد کا اظہار کیا ہے وہ پوری انسانیت کا درد ہے ۔ کہیں کہیں بناوٹ اور تصنع کا احساس ضرور ہوتا ہے ۔ تاہم ان نظموں کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ یہی فروغ کی تمام شاعری میں انسانیت کے لیے امید کا روزن ہیں اور انھی میں اُس کے عشق نے نیا عرفان پایا ہے ۔

فروغ اپنے فن کے لحاظ سے مہدی اخوان اور احمد شاملو کے درمیان پُل ہے ۔ مہدی اخوان کی طرح فروغ نے بھی باقاعدہ نظمیں کہی ہیں ۔ لیکن اُسے اخوان کی سی قدرتِ لسانی حاصل نہیں ہوسکی ۔ دوسری طرف جہاں اُس نے آزاد نظم لکھی ہے اُس میں احمد شاملو کی سی وسعتِ فکر اور لغت کا تنوع پیدا نہیں ہو سکا ۔ ان دونوں شاعروں کی ذہنی توانائی سے بھی فروغ ایک حد تک محروم رہی ہے ۔

انسانی تہذیب کے ماضی سے اُس کی ناواقفیت اور جدید انسانی مسائل سے اُس کی بے پروائی کی وجہ سے اُس کی شاعری کا بیشتر حصہ خود مستی کے مترادف بن کر رہ گیا ہے، اور وہ اُس عشق کی ترجمان بن گئی ہے جو جنسی کامیابی پر منتج ہو۔ اس لحاظ سے وہ احمد شاملو سے بہت ملتی ہے لیکن احمد شاملو کی سی خود نگری اُس کو نہیں آسکی۔ فروغ کی تصویروں میں بڑی ندرت ہے اور ہرچند اُس کی زبان مہدی اخوان کی زبان کے مانند "عالمانہ" نہیں، لیکن اُس نے عوام کے الفاظ اور محاورے شعر میں شامل کر کے زبان کو بڑی وسعت دی ہے۔

محمود کیانوش کا شمار بڑے شاعروں میں نہیں ہوتا لیکن اُس نے بعض ایسی نظمیں لکھی ہیں جو اپنے فلسفیانہ طرزِ فکر کی وجہ سے اُسے دوسرے جدید شاعروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ محمود کیانوش کا موضوع انسان ہے۔ انسان اگر فطرت کا جزو ہے تو محض اتفاق سے، ورنہ وہ زمین کی طرح کامل نہیں۔ اُسے فکر کی مصیبت (یا دولت) بخشی گئی ہے۔ انسان بھول جانا چاہتا ہے کہ وہ انسان ہے، لیکن وہ اس دنیا کی "ارضی حقیقتوں" میں اس حد تک گرفتار ہے کہ بھول نہیں سکتا۔ وہ زمین پر حاکم نہیں، زمین اُس کے لیے نہیں بنائی گئی۔ وہ محض اتفاق سے اس زمین پر ہے۔ اس لحاظ سے محمود کیانوش کے خیالات پر وجودی فلسفیوں کا پرتو نظر آتا ہے۔ لیکن وہ فلسفۂ وجود کی زیادہ گہرائیوں تک نہیں پہنچ پایا۔ کیانوش کی شاعری کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف کہیں کہیں سیاسی اشارے کنائے اُس کی شاعری میں ملتے ہیں۔ وہ بیشتر انسان کے ہمیشہ کے دکھوں کا ذکر کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسان کے لیے

ضروری نہیں کہ وہ موت کو قبول کرے ، کیونکہ موت صرف ایک "تبدیلی" ہے ـــ تناسخ کے معنوں میں نہیں بلکہ ان معنوں میں کہ موت انسان کی غیر متناہی زندگی میں محض ایک مرحلہ ہے ، یا ایک مرحلے کا انجام ۔ اُس کی شاعری میں بالعموم ذاتی درد یا غم یا مسرت کا کوئی اظہار نہیں ۔ اپنی نظم "کون سا درد ؟" میں بھی ، جو اس مجموعے کے لیے انتخاب کی گئی ہے ، وہ بظاہر ذاتی درد کا اظہار کرتا ہے لیکن دراصل یہ ذاتی درد نہیں ۔ اس نظم میں اُس نے مسیح کی تمثیل سے کام لے کر ایک ایسے انسان کا نقشہ کھینچا ہے جو سب انسانوں کی بدبختی کے "نشے" میں چُور اس بدبختی کو رفع کرنے کے لیے قربانی دیتا ہے ۔ لیکن انسان کی بدبختی کی کوئی انتہا نہیں ، اس لیے کوئی قربانی انسان کو اس سے کامل طور پر نجات نہیں دلا سکتی ۔ "میں نے کہا گیت ـــ" میں بھی کیانوش نے دراصل ایک فنکار کے عجز کا ذکر کیا ہے جو انسانوں کے درد کی تصویر کشی کرنے میں ناکام رہتا ہے ۔ کیانوش کی اکثر نظموں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فطرت اور انسان کے باہمی رشتے پر حیرت میں گُم نظر آتا ہے ۔ بعض نقادوں نے اُس کی شاعری میں ندرت اور انفرادیت کی کمی محسوس کی ہے اور اُس کے خیالات کو رسمی ثابت کیا ہے ۔ تاہم وہ سادہ زبان میں بعض دفعہ گہرے فلسفیانہ نکات بیان کر جاتا ہے اور یہی اُس کی انفرادیت ہے ۔

ڈاکٹر رضا براہنی ، ڈاکٹر وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مانند شاعر بھی ہے اور نقاد بھی ۔ اگرچہ وہ اپنی شاعرانہ حیثیت کو افضل سمجھتا ہے لیکن میری رائے میں تنقید میں اُس نے فارسی ادب کی جو خدمت کی ہے وہ زیادہ دیرپا اور قابل احترام ہے ۔ اس

سے پہلے فارسی تنقید کی حیثیت بیشتر رسمی اور مربیانہ تھی۔ لیکن وہ پہلا نقاد ہے جس نے تجزیاتی تنقید کو رواج دیا ہے۔ تنقید میں اُس کی بے باکی بعض دفعہ شاعروں اور ادیبوں کے لیے دل شکن ضرور ثابت ہوئی ہے، لیکن ساتھ ہی اُس نے نئے لکھنے والوں کی بڑی رہنمائی کی ہے۔ رضا براہنی کی شاعری میں دوسروں کے مقابلے میں بڑا تنوع ہے اور اُس کے استعارے اور کنائے بے حد لطیف اور عمیق ہوتے ہیں۔ جانوروں میں ہرن اور پرندوں میں ابابیل اور بلبل اُسے پسند ہیں۔ لیکن بلبل جیسے "فرسودہ" پرندے کو بھی اُس نے نئے سے نئے سیاق و سباق میں استعمال کیا ہے۔ اُس کے ہاں ابابیل اور بلبل اکثر انسان کی آرزوؤں اور امنگوں کی تمثیل کے طور پر آئے ہیں۔ جیسے اُس کی نظم "پرندوں کا جنازہ" میں جو آپ کو اس مجموعے میں نہیں ملے گی۔ براہنی کی ابتدائی شاعری قدیم تصوف اور عرفان سے بے حد متاثر تھی، لیکن اب وہ بیشتر سیاسی یا اخلاقی افکار کے اظہار کے لیے عرفانی اشارات سے کام لیتا ہے۔ اُس کی تازہ ترین نظمیں عشقیہ ہیں اور اُن سے ایک عظیم عشق نمودار ہوتا نظر آتا ہے۔ ان نظموں میں اکثر حسن و جمال کی دلفریبی اور اُس کے لیے مرد کی تمنا کا جلال باہم مخلوط ہو جاتے ہیں۔ اُس کی شاعری میں ایک نادر قوت اور شکوہ ہے، اور یہ قوت یا شکوہ صرف الفاظ ہی پر منحصر نہیں بلکہ افکار پر بھی اس کا دار و مدار ہے۔ اُس کی تکنیک جو اُسے دوسرے جدید شاعروں سے ممتاز کرتی ہے، جملۂ معترضہ کے استعمال سے ابہام پیدا کرنا ہے۔ یہ معترضہ جملے بعض دفعہ مبتدا اور خبر میں نحوی فاصلے پیدا کر دیتے ہیں۔ تاہم نظموں کی منطقی تنظیم پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ بلکہ اُس میں اکثر مدد ثابت ہوتے ہیں۔ اُس کی شروع کی نظموں میں فحاشی یا

عریانی کے عناصر خاصے نمایاں تھے جن کا بظاہر کوئی جواز نہ ہوتا تھا ــــ موضوع یا ہیئت دونوں میں سے کسی اعتبار سے۔ لیکن نئی نظموں میں یہ اتنے نمایاں نہیں رہے۔ اسی طرح اس کی نظموں میں ایک طرح کی شدت بھی پائی جاتی ہے، جو سادیت کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ اسے اور چیزوں کے علاوہ دیوانوں یا مجذوبوں میں بڑی کشش نظر آتی ہے اور وہ اکثر ان کی طرف اشارات بڑی محبت کے ساتھ کرتا ہے۔

رضا براہنی کے مانند محمد حقوقی بھی فلسفیانہ شاعر ہے اور اسی کی طرح قدیم تصوف اور خاص طور پر رومی سے بے حد متاثر نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری رومی کی شاعری کی طرح فلسفیانہ استفہام اور حافظ کی شاعری کے مانند فلسفیانہ تحیّر کی شاعری ہے۔ لیکن اس کی شاعری پر علم کا بوجھ بری طرح سوار ہے اور رومی یا حافظ کی تڑپ اور طلب اس کے نیچے محض دبی دبی نظر آتی ہے۔ البتہ اس کی متانت میں عام صوفی کا رؤیا اور کاہن کی سی پیش بینی کے عناصر غالب ہیں۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ اقبال کے مانند مشرق کی برتری کا مسئلہ ہے جس کی علامت اس کی شاعری میں (بعض شکوک کے ساتھ) رومی ہے۔ تاہم حقوقی جدید فارسی شاعروں میں غالباً تنہا عرفان پرست شاعر ہے۔ ہرچند تکنیک کے اعتبار سے وہ بعض جدید شاعروں سے بھی جدید تر نظر آتا ہے۔ مثلاً مصرعوں کو نامکمل چھوڑ کر، ان کمی کو نقطوں کے ذریعے بیان کرنا اس کا خاص فن ہے۔ اس سے جہاں شعر کے عادی قاری غیر ضروری اکتاہٹ سے بچ جاتے ہیں، وہیں نافہم پڑھنے والے اطمینان نہیں پا سکتے۔ ذاتِ الٰہی جس سے وہ اپنی اکثر نظموں

میں مخاطب ہے، ایک طرح سے انسان ہی کا روپ ہے۔ قدیم صوفیوں کے برعکس، جن کا انسان خدا کا پرتو ہوا کرتا تھا، اور اقبال کے برعکس، جس کی شاعری میں انسان اور خدا ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوتے ہیں، حقوقی کے نزدیک خدا چلتے پھرتے انسانوں کی طرح ہمارے روزمرہ کے کاموں میں شریک رہتا ہے۔ حقوقی کی شاعری میں علامات اور استعارات نہایت دقیق بھی ہیں اور گنجان بھی اور وہ تصوّف کے مسلّمہ اور مروّجہ تصوّرات یا کنایات کی کورانہ پیروی کرنے کی بجائے اکثر نئے نئے تصورات پیدا کرتا رہتا ہے۔

حقوقی کے مانند، اسماعیل خوئی کی شاعری کی ابتدا فلسفے سے ہوئی لیکن اس کی ابتدائی نظموں میں ــــ مثلاً "گرما" میں ــــ فلسفہ نہایت کتابی نظر آتا ہے۔ اور وہ اس کتابی فلسفے کی مدد سے انسانی صورتِ حال پر روشنی ڈالنے کا کام نہیں لیتا، بلکہ کوئی سا فلسفیانہ نظریہ لے کر اس پر "خیال آرائی" کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا مجموعہ "بے تاب" روایتی فلسفیانہ اور عارفانہ غزلوں پر مشتمل تھا، لیکن دوسرے مجموعے "برخنگِ راہوارِ زمین" میں اس کی شاعری پر مغربی فلسفیانہ تصوّرات کا اثر پڑنا شروع ہوا ــــ مثلاً انسان کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں اس کے تصوّرات جو خود مغرب میں بھی اب محض "مقدس" رہ گئے ہیں۔ اس مجموعے کی نظموں میں انسان کی تاریک یا روشن، پُرشور یا خاموش ارضی ہستی کے بارے میں کسی اصیل فکر کا سراغ نہیں ملتا، اور زبان بھی بڑی حد تک مہدی اخوان ثالث کی زبان سے مشابہت رکھتی ہے ــــ خاص طور پر پرانے لغت کے استعمال میں جو خراسان کے مقامی

محاورے سے اخذ کیے گئے ہیں ۔ ساتھ ساتھ خوئی ، مہدی اخوان کے اُن انکشافات سے بھی متاثر نظر آتا ہے جو مؤخر الذکر نے زبان کے نئے نئے امکانات کے بارے میں کیے ہیں ۔ اس کے علاوہ اُسی کی طرح وہ شعر کے اندر منطقی ہم آہنگی کا جویا نظر آتا ہے ۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ خوئی کے اندر خلاق کا کوئی ذاتی جوہر موجود نہیں ۔ خوئی کی شاعری میں فکر سب سے مقدم ہے ، لیکن وہ اس فکر کو مسلسل نہیں بلکہ متفاوت تصویروں کے ذریعے قاری تک پہنچاتا ہے ۔ اُس کی شاعری میں عشق یا غنائیت کم ہے ۔ فلسفہ اور اجتماعی فکر زیادہ ۔ اجتماعی فکر اُس کی تازہ ترین نظموں میں بھی نمایاں ہے ۔ اِس میں بھی اُس کی تصویریں مرئی اشیا سے نہیں بلکہ ذہنی اور فلسفیانہ تصوّرات سے ماخوذ ہوتی ہیں ۔ اُن شاعروں کے مقابلے میں ، جو اپنی تصویریں فطرت کے مظاہرات سے کسب کرتے ہیں ، خوئی بیشتر بیرونی اور واقعی اشیا کو اندرونی اور ذہنی واردات کے ساتھ تشبیہ دینے کا عادی ہے ۔ تازہ نظموں میں اُس نے فکر کی جو تجدید کی ہے ، وہ ذات کو محو کرنے کے مترادف ہے ۔ یعنی اب وہ فلسفیانہ موشگافیوں سے ہٹ کر ایسے موضوع تلاش کرتا ہے جن کی حیثیت اجتماعی ہو ۔ مثلاً "شمال بھی" اور "سڑک کی خاکی لمبائی میں" کے اندر ۔ اول الذکر نظم میں شہر کا شمال و جنوب گویا پوری دنیا کا شمال و جنوب ہے ، جو بربادی اور آبادی میں برابر کے شریک ہیں ۔ مؤخر الذکر نظم فوج پرستی کے غیر اخلاقی نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ ان موضوعات کے بیان میں خوئی نے خاصے تنوع سے کام لیا ہے اور الفاظ کے سطحی معانی کو چھوڑ کر اُن کے تہ در تہ معانی کی طرف توجہ دی ہے ۔ اس سے اُن موضوعات کا چہرہ ہی روشن نہیں ہوتا بلکہ اُن کا پشتانہ بھی اجاگر ہو جاتا ہے ۔

خوئی کی بعض نظموں میں مہدی اخوان کے مانند طنز و تضحیک کے عناصر بھی ملتے ہیں ، لیکن اُن میں کسی طرح کی یبوست پیدا نہیں ہو پاتی ۔

شفیعی کدکنی (م ۔ سرشک) کی شاعری میں ایک طرف محمد زہری کے مانند انسان کے اس دنیا میں قیدی ہونے کے تصوّرات ہیں اور دوسری طرف موجودہ زمانے کی چیستان سے بھی اُسے برابر سروکار ہے ۔ ان دونوں تصوّرات کا تعلق ایک طرح سے سیاستِ حاضرہ سے ہے ۔ لیکن شفیعی کدکنی بنیادی طور پر سیاسی شاعر نہیں ۔ انسان کے جس قفس کا وہ ذکر کرتا ہے وہ مادیّت کا قفس ہے ، جس میں وہ روزانہ مجبوریاں شامل ہیں جن سے انسان کو کوئی مفر نہیں رہا ۔ صوفیا کی طرح انسان کی ازلی اور ابدی مجبوری سے سرشک کو کوئی براہِ راست واسطہ نہیں ہے ۔ تاہم وہ صرف اپنے زمانے کی تفسیر نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی صورت حال کا ذکر کرتا ہے جس میں انسان ذہنی اذیّت کا شکار ہے ۔ اس کے علاوہ موجودہ انسان کے تذبذب اور اُس کے ناکافی پن کی طرف بھی اُس کی شاعری میں اشارات ملتے ہیں ۔ سرشک کے نزدیک انسان صرف اس حالت میں ہے کہ اپنے ذہنی خزینوں کی طرف لوٹ کر ، سکون یا نجات پا سکے ۔ عجیب بات ہے کہ صرف سرشک ہی نہیں بلکہ فارسی کے کئی اور جدید شاعر کی مثلاً مہدی اخوان ثالث اور رضا براہنی وغیرہ بھی جدید انسان کی اپنے ماضی کی طرف رجعت میں اس کی نجات تلاش کرتے ہیں ۔ لیکن سرشک کی شاعری میں یہ قیدی پرندہ ، جس کا نام انسان ہے ، اگر چند دانوں یا پانی کے چند قطروں پر قناعت نہ کر لے تو بہت کچھ کرنے کا اہل ہے ۔

جس جدید شاعر کو خالص سیاسی شاعر کہا جا سکتا ہے، شاید وہ محمد علی (م۔ع) سپانلو ہے۔ اس کے ذہن پر جنگیں اور جنگوں کے دوران میں انسان کی اندرونی کشمکش کے نقشے چھائے رہتے ہیں۔ وہ اس سیاسی کشمکش کی پیدا کی ہوئی بے اطمینانی کا نوحہ گر ہے جس نے انسان کو بدی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ سپانلو اس بدی پر سخت کرب کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کی نگاہیں بہی کئی اور جدید شاعروں کے مانند اس ماضی کی طرف بار بار اٹھتی ہیں جس میں اس کے خیال میں انسان کے لیے زیادہ سکون کا امکان ہے۔ سرشک کے مانند وہ اِس لوہے اور سیمنٹ کے زمانے کے انسان کو انسانی تقدیر کا ضروری جزو نہیں سمجھتا۔ اسی لیے سپانلو حال کے ساتھ انسان کی مفاہمت کے اندر ایسا واسطہ نہیں پاتا جو اسے اپنی صحیح تقدیر کے ساتھ دوبارہ پیوست کر دے۔ اس کے نزدیک ماضی ہی میں سکون ہے۔ وہیں وہ لوگ بستے ہیں جن کے ساتھ پیار کیا جا سکتا ہے۔ وہیں زندگی کی رفتار اتنی آہستہ اور نرم ہے کہ اس کے ساتھ نباہ ہو سکے۔ سپانلو کی شاعری انسان کی باطنی زندگی پر جنگ اور سیاست کی شکست و ریخت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کسی اور باطنی کشمکش کی طرف نہیں۔ دشمن جنگ ہے اور اس کی اصل مادیت ہے۔ سپانلو کی زبان متروک اور نامانوس الفاظ سے بھری پڑی ہے اور بعض دفعہ خالص اخباری اصطلاحات اور محاورے اس زبان پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ اس سے شاید سپانلو کو مفر نہیں کیونکہ اس کا موضوع بیشتر تاریخی حوادث ہیں۔ اس کی تصویریں بھی یا عہدِ حاضر کے سیاسی حالات سے یا جنگوں کی تاریخ سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی خیالی اور مابعد الطبیعی دنیا کے گرد بھی اس کا فکر گھومنے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان اور اشیا ہر دم آواگون

کی منزل میں ہیں اور وہ اس عمل کو حیرت اور ہراس سے دیکھتا ہے ۔ بھاری بندوقیں ، توپیں ، طیارے ، پیرا شوٹ ، باوردی سپاہیوں کا مارچ وغیرہ اس ہراس کو تقویت دیتے ہیں ۔ اس پس منظر میں شاعر متواتر موت پر غور کرتا ہے اور آنے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ عشق کہیں ان اجتماعی آلام اور مصائب کا شکار نہ ہو جائے ۔ یعنی زمانے کی سخت واقعیت انسان کی انسانیت کو نگل نہ جائے ۔

احمد رضا احمدی کی دو نظموں کے ساتھ یہ مجموعہ ختم ہو جاتا ہے ۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس کی شاعری کے ساتھ ہم جدید فارسی شاعری کے ایک نئے دور میں داخل ہوتے ہیں ، جسے ''موجِ نو'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ احمدی کو اس تحریک کا رہنما جان کر ، اس کی مذمت بھی کی جاتی ہے اور عزت بھی ۔ اس نے اپنی لٹ کھٹ نظموں میں نوجوانانہ تجربات کئی سمتوں سے لا کر جمع کر دیے ہیں ۔ اس کی نظمیں روزانہ زندگی کی تصویروں سے اٹی پڑی ہیں ، لیکن ان میں بظاہر کوئی ربط نہیں ہوتا ۔ اس میں وہ بڑی حد تک نصرت رحمانی اور اس سے بھی زیادہ م ۔ آزاد سے متاثر ہوا ہے ۔ بلکہ اس کی اس تکنیک کا ڈانڈا اسماعیل شاہرودی سے بھی جا ملتا ہے ۔ ممکن ہے یہ تینوں شاعر بھی خود اس جوانانہ تحریک کے زیر اثر ہوں ۔ فرق یہ ہے کہ ان شاعروں کے برعکس ، احمدی کی شاعری مجرّد شاعری ہے اور اس میں کوئی نام نہاد روایتی یا ذاتی انسانی درد نہیں ۔ کوئی عشق بھی نہیں جس کا ذکر وہ کسی امنگ کے ساتھ کرنا چاہے ، حتی کہ کوئی ہوس بھی نہیں جس میں وہ دزدانہ مبتلا ہو ۔ فطرت کی پرستش کا کوئی جذبہ بھی نہیں ، جو اسے فطرت کی زیبائی کی تماشی ہر آکسائے ۔ کسی سیاست سے بھی

واسطہ نہیں جو انسانی زندگی میں مخل ہوتی ہو یا اسے علو بخشتی ہو یا انسان کو غم اور ہراس میں مبتلا کرتی ہو۔ لیکن احمدی کو زندگی کے ساتھ، زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ساتھ، جن کا انسان کے جسم کی پھیلی ہوئی ضروریات سے تعلق ہے، بڑی ہمدردی ہے۔ فروغ فرخزاد کے مانند ان سب اشیا کے لیے اس کے دل میں بے پناہ کشش موجود رہتی ہے۔ ان کی زیبائی کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے "امکانات" کی بنا پر۔ ان کے خالص اور مجرّد مسرت اور انبساط بخشنے کے امکانات کے باعث، جنھیں وہ اپنی شاعری کے ذریعے دریافت کرتا رہتا ہے۔ احمدی نے نیما اور اس کے براہِ راست پیروؤں کے افکار اور طریقِ کار دونوں سے انحراف کیا ہے۔ سب سے بڑا انحراف تکنیک کا ہے۔ یعنی نیما کے برعکس، جو مرئی تصویروں کو نہایت التزام کے ساتھ مرتب کرتا تھا، احمدی صرف "دھبوں" کے ذریعے ایک بھرپور نقشہ پیدا کر لیتا ہے۔ دوسرا سبب اس کے انحراف کا یہ ہے کہ وہ کسی نصب العین کا قائل یا پیرو نہیں۔ یعنی قلم دوات لے کر نصب العین کا فارمولا نہیں بناتا کہ پھر اس کے لیے الفاظ، تراکیب اور استعارے وغیرہ لا کر جمع کرنے پڑیں، اور اس طرح اینٹ پر اینٹ رکھ کر شعر کی عمارت کھڑی کی جائے۔ احمدی کے مخالفوں میں سے ایک م۔ سرشک بھی ہے جو لکھتا ہے کہ "موجِ نو" کے شاعر "حرف خانوں (یا معموں) سے الفاظ چن چن کر آپس میں جوڑ دیتے ہیں — الفاظ کو کسی تار میں باہم نہیں پروتے — الفاظ سے محض کھیلتے ہیں — ان کی شاعری سے کوئی تاثر تا تصور یا کیفیت پیدا نہیں ہوتی!" — لیکن احمدی کے نقاد اس زیبائی کو صرفِ نظر کر دیتے ہیں جو اس بظاہر بے ربطی سے پھوٹ بہتی ہے، اور کسی بلند تر مقصد کی عدم موجودگی کے

باوجود انسان کے اندر جمالی کیفیت کا علو پیدا کر دیتی ہے۔

"موجِ نو" کے شاعروں پر جو الزام لگائے جا رہے ہیں، ان میں ان تمام الزامات کی بازگشت سنائی دیتی ہے، جو نیما یوشیج پر یا اردو کے جدید اور جدید تر شاعروں پر وقتاً فوقتاً لگائے گئے ہیں۔ نیما یوشیج اور اس کے پیرووں کے بارے میں آج تک یہ کہا جاتا ہے کہ "انھوں نے مغربی شاعری اور مغربی تمدن کے زیرِ اثر اپنی زبان اور ادب کی روایات ترک کر دی ہیں — انھوں نے اپنی زبان کے شکوہ کو فراموش کر دیا ہے — وہ زبان کو بگاڑ رہے ہیں — ان کی شاعری میں پراگندگی ہے — ان کی شاعری مبہم رموز و کنایات سے بھری پڑی ہے، جس کی وجہ سے یہ عوام سے دور ہیں — جس چیز کو وہ طرزِ جدید کہہ کر پیش کر رہے ہیں، وہ محض قدامت ہی کی ایک شکل ہے — یہ لوگ اپنے بزرگوں کی بصیرت اور جہاں بینی سے محروم ہیں — ذاتی تجربات کی بجائے ان کا دامن غیر ملکی افکار سے بھرا ہوا ہے — ان کی شاعری محض فریب ہے — ان کی شاعری میں سچے ہنر کی روح نہیں — یہ لوگ اپنے ہی درد و غم میں الجھے ہوئے ہیں اور انھیں اپنے گرد و پیش کے مسائل کی کوئی پروا نہیں —" وغیرہ وغیرہ۔

اور اب "موجِ نو" کے شاعروں پر پرانے جدید شاعر بھی وہی الزام لگا رہے ہیں جو کبھی ان پر لگائے گئے تھے۔ مثلاً احمد شاملو کا کہنا ہے: "بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے نئے ادیب اور شاعر زبان پر قابو نہیں رکھتے۔ ان کی بڑی اکثریت زبان کے قواعد تک سے آگاہ نہیں۔ ان کی مثال ان ڈرائیوروں کی ہے جو صرف صاف ستھرے اور سیدھے راستوں پر گاڑی چلانا جانتے ہوں۔

ان کے پاس کسی مطلب کو بیان کرنے کے لیے دو چار کلمات سے زیادہ نہیں ہوتے، اور وہ ان کلمات کے معانی اور ان کی قدرت اور وسعت سے بھی بے خبر ہوتے ہیں، بلکہ وہ تو بعض نہایت پیش پا افتادہ الفاظ کا بھی مطلب نہیں سمجھتے"۔ نادر نادر پور کہتا ہے:

"آج کل نظم و نثر کے نام سے جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ ایسی زبان میں لکھا جا رہا ہے جسے فارسی نہیں کہا جا سکتا۔ عنانِ قلم ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو نئی زبان تیار کرنے پر تلے ہوئے ہیں — یہ لوگ غارت گروں کی جماعت ہیں جو شعر کی نیم آباد بستیوں پر ٹوٹ پڑی ہے۔" محمد زہری کو اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ نوجوانوں کی اکثر نظموں کو پورے طور پر سمجھ نہیں پاتا۔ وہ کہتا ہے:

"شاید وہ دن آ جائے جب ہماری بے سرو سامانی، سروسامان پیدا کرلے — وزن اور قافیے کا ہونا نہ ہونا چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن جو کچھ آج کل لکھا جا رہا ہے اس کے معنی بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ انھیں سمجھنے کی کوشش ضروری ہو۔ ہر مطلب ابہام کے پردوں میں الجھا ہوا ہے اور شاعر کو اپنی تفسیر اور تشریح آپ کرنی پڑتی ہے۔ آج کل کی شاعری میں ہم جس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں وہ فکر ہے۔ اکثر شاعروں میں احساس موجود ہے لیکن ان کا فکر کمزور ہے —" ڈاکٹر رضا براہنی جو بالعموم ہر شاعر کو مفرد طور پر، اس کے اپنے دعاوی کی روشنی میں، پرکھنے کا عادی ہے، وہ بھی "موجِ نو" کے ذکر میں یہ کہنے پر مجبور دکھائی دیتا ہے: "جو کچھ جدید شاعری کے نام سے لکھا جا رہا ہے، اس کی پراگندگی اور بے شعوری کو صرفِ نظر کر کے ہمیں "اصل" شاعری کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ایسی شاعری پیش کرنی چاہیے جو منظم اور متشکل ہو اور جس کا کوئی معین ہدف ہو"۔

یقین ہے کہ ''موجِ نو'' کے شاعر آج سے چند سال بعد اپنے بعد آنے والوں پر اسی طرح نکتہ چینی کرتے دکھائی دیں گے ! اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا جیسے آج تک جاری رہا ہے۔

موجودہ مجموعے میں اصل نظمیں اور ان کے ساتھ ان کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے — اس لیے کہ ان لوگوں کی تعداد ہمارے برعظیم میں آئے دن کم ہوتی جا رہی ہے جو فارسی اور خاص طور پر جدید فارسی میں شعر براہِ راست پڑھ کر حظ اٹھا سکتے ہوں۔ یہ ترجمے سب کے سب نثر میں کیے گئے ہیں — ایک تو اس لیے کہ اکثر شاعروں کے ہاں وزن اور قافیہ نہیں ہے۔ دوسرے نظم میں ان کا ترجمہ کرنا انھیں ذبح کرنا ہے۔ تاہم اس ترجمے میں اصل نظموں کے افکار اور تصاویر، بلکہ ان کے ابہام اور ایہام تک، کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو لوگ جدید اردو شاعری سے واقفیت رکھتے ہیں، ان کے لیے ان نظموں کے مفہوم اور ان کی خوبصورتی تک پہنچنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔

آخر میں میں اپنے دوست جمیل جالبی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے سب سے پہلے ''نیا دور'' کے لیے ''جدید فارسی شاعری'' پر قلم آزمانے کی دعوت دی۔ اس کے علاوہ اپنے سابق ہم کار محمد علی طالقانی کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے نیما یوشیج کو سمجھنے سمجھانے کے مواقع مجھے بہم پہنچائے۔ اور اپنے ہم کار منصور فراسیون کا، جنھوں نے شعر سے اپنی دلچسپی کے فقدان کے باوجود، میری طرف سے شاعروں کے ساتھ خط و کتابت کی اور ان کو جمع کرنے کے راستے پیدا کیے۔ سب سے زیادہ ان تمام شعرا کا ممنون ہوں جنھوں نے نہ صرف اپنے اشعار اس مجموعے میں شامل

کرنے کی تحریری اجازت دی ، بلکہ میرے ساتھ کئی شامیں گزار کر مجھے اپنے اشعار گویا درساً پڑھائے ۔ ان میں خاص طور پر محمود کیانوش ، نادر نادر پور ، احمد شاملو ، ید اللہ رؤیائی ، منوچہر آتشی ، اسماعیل خوئی ، م ۔ سرشک اور ڈاکٹر رضا براہنی شامل ہیں ۔ ان کی عملی مدد کے بغیر اس مجموعے کا تکمیل پانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ۔ ڈاکٹر براہنی کے علاوہ ، میں نے ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری ، اسماعیل نوری علا اور عبدالعلی دست غیب کے مقالات اور تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ ان کی اکثر آرا سے مجھے اختلاف ہے ، لیکن ان کے مضامین کے مطالعے سے اس مجموعے میں شامل شعرا کے کلام کے کئی پہلو مجھ پر روشن ہوئے ہیں ۔ نیما یوشیج اور فروغ فرخزاد اس دنیا میں نہیں ، لیکن ان کی متعدد تحریریں میرے کام آئی ہیں ۔ فروغ مرحومہ کے والدگرامی کرنل فرخزاد کا ممنون ہوں جنھوں نے فروغ کے اشعار شامل کرنے کی اجازت دی اور اس کی زندگی پر روشنی ڈالی اور مرحومہ کی قبر تک میری رہنمائی کی ۔

اپنی بیوی شیلا کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں ، جنھوں نے اس کتاب کی تالیف کے دوران میں چشم پوشی کی اور بردباری سے کام لیا اور کئی طرح سے میری حوصلہ افزائی کی.

تہران ۱۹ جنوری ۱۹۷۰ء   ن ۔ م ۔ راشد

نیما یوشیج

(۱۸۹۵ع - ۱۹۵۹ع)

طبرستان کے گاؤں یوش میں پیدا ہوئے اور تہران میں وفات پائی - ابتدائی تعلیم اپنے والدین سے اور مشہور شاعر نظام وفا سے حاصل کی - مؤخر الذکر کی صحبت میں شاعری کا ذوق پیدا ہوا - تہران کے مدرسہ سین لوئی میں فرانسیسی سیکھی اور آستارا کے دبیرستانِ حکیم نظامی سے فارسی زبان اور ادب کی تعلیم مکمل کی - شروع میں غزلیں اور رباعیاں کہیں - خیال ہے کہ پہلی آزاد نظم ۱۹۲۶ع میں کہی، لیکن باقاعدہ آزاد شاعری ۱۹۳۵ع میں رسالہ "موسیقی" کی ادارت میں شامل ہونے کے بعد شروع کی - ۱۹۴۸ع کے بعد کئی برس تک وزارتِ اطلاعات کے شعبہ مطبوعات میں تنقید اور تحقیق کے فرائض انجام دیے - اپنی زندگی میں اپنی تصانیف کی جو فہرست مرتب کی اس میں انیس کتابیں شامل ہیں - بعد میں مختلف اداروں نے حسبِ منشا ان تصانیف کے مخلوط ایڈیشن شائع کیے ہیں - متعدد تنقیدی مضامین بھی ان کے قلم سے یادگار ہیں - ان میں سے بعض ۱۹۶۹ع میں "یادداشتہا ــــ" کے نام سے شائع کیے گئے ہیں - زیر نظر مجموعے میں جو نظمیں اور ان کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے وہ ڈاکٹر ابوالقاسم جنتی عطائی کی تالیف "نیما یوشیج : زندگانی و آثارِ او" کے علاوہ ایک جیبی انتخاب سے ماخوذ ہیں (تہران : ۱۹۶۸ع) - تصحیح کے لیے متعدد اور نسخوں سے بھی رجوع کیا گیا ہے -

میتراود مهتاب

میتراود مهتاب
میدرخشد شب تاب
نیست یکدم شکند خواب بچشم کس ولیک
غم این خفتهٔ چند
خواب در چشم ترم میشکند ـ

نگران بامن استاده سحر
صبح ، میخواهد از من
کز مبارک دم او آورم این قوم بجان باخته را بلکه خبر
در جگر خاری لیکن
از ره این سفرم میشکند

نازک آرای تن ساق گلی
که بجانش کشتم
و بجان دادمش آب
ای دریغا ! ببرم میشکند

دستها میسایم
تا دری بگشایم ،
بر عبث می پایم
که بدر کس آید ،
در و دیوار بهم ریخته شان
بر سرم میشکند ـ

میتراود مہتاب
میدرخشد شب تاب
مانده پای آبله از راه دراز
بردم دهکده مردی تنہا ،
کوله بارش بر دوش ،
دست او بردر ، میگوید باخود :
— ”غم این خفتہٗ چند
خواب در چشم ترم میشکند !“

قطرہ قطرہ گر رہی ہے چاندنی

قطرہ قطرہ گر رہی ہے چاندنی ،
چمک رہے ہیں جگنو ،
کوئی شے ایسی نہیں ، جو کسی کی آنکھ کی نیند
آن بھر کے لیے توڑ دے ، لیکن
میری آنسو بھری آنکھوں کی نیند
ٹوٹ چکی ہے ، ان نیند کے ماتوں کے غم میں

سحر میرے ساتھ پریشان حال ٹھہر گئی ہے
صبح چاہتی ہے کہ میں اس کے مبارک دم سے
ان جان ہارے لوگوں کو بشارت دوں ،
لیکن اس سفر کے خیال ہی سے
میرے جگر میں کانٹا سا اٹک گیا ہے
گلاب کی اس نازوں پلی کونپل کا بدن ،
جسے میں نے اپنے دل و جاں سے بویا تھا

اور جسے میں نے اپنے دل و جان سے پالا پوسا تھا ،
افسوس ! آج وہی میرے پہلو میں ٹوٹ رہا ہے

میں دیواروں پر اپنے ہاتھ پھیر رہا ہوں
تاکہ کوئی دروازہ کھول سکوں ،
میں بے کار کھڑا تکتا ہوں
کہ شاید کوئی دروازے پر آ جائے ،
لیکن ان کے اجڑے در و دیوار
میرے سر پر گرنے لگے ہیں

قطرہ قطرہ گر رہی ہے چاندنی ،
چمک رہے ہیں جگنو ،
ایک تھکا ہارا تنہا شخص کہیں دور نگر سے آیا ہے
اس کے پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں
وہ ایک دیہاتی گھر کے دروازے پر رک گیا ہے
اس کے سر پر گٹھری ہے
اس کا ہاتھ دروازے پر ہے
اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے :
— میری آنسو بھری آنکھوں کی نیند
ٹوٹ چکی ہے ، ان نیند کے ماتوں کے غم میں

سایهٔ خود

در ساحت دهلیز سرای من و تو
سردیست نشسته از برش مشعل نور
هر روز و به هر شب از برای من و تو
در بر بگشاده نقشهٔ بی زین شب دور

انگیخته از نهادش :
رگهای صدا .
یک خنده نه از لبانش ،
یکدم شده وا .

می بیند او به زیر ویرانهٔ شب
در روشنی شرارهٔ بی سرد شده
در شادی روزی ، نه در آن خورشیدی
در گردش یک شب پر از درد شده
نوحی کند او هزار اندوه نهفت .

اما چو به ناگهان نگاهش افتد ،
بر سایهٔ خود اگرچه از او نه جدا
لبخندزده ،
فریاد بر آورد . بماند
از چشم من و تو در زمان نا پیدا .

سایہ میرا

من و تو کے مسافر خانے کی ڈیوڑھی میں

ایک شخص بیٹھا ہے مشعلِ نور لیے ،
ہر روز اور ہر رات من و تو کی خاطر
اس دور تک پھیلی ہوئی رات کا نقشہ
اس کے سامنے کھلا رہتا ہے

اُس کے ضمیر سے
صدا کی رگیں اُبھر آئی ہیں ،
لیکن اُس کے ہونٹوں پر
کبھی لمحے بھر کو بھی مسکراہٹ نہیں اُلھتی !

وہ رات کے کھنڈر کی تہ میں
ایک بجھے ہوئے شرارے کی دمک میں
جھانکتا ہے
ایک ایسے دن کی یاد میں ، جس میں کوئی سورج نہیں تھا ؛
ایک ہی دردناک رات کی گردش کے اندر
وہ ہزاروں چھپے ہوئے غم تازہ کر لیتا ہے

لیکن جب اچانک اُس کی نظر اپنے سایے پر پڑتی ہے ۔
وہ سایہ جو خود اُس کے وجود سے الگ نہیں
تو وہ مسکرا کر ایک نعرہ لگاتا ہے
اور پھر وقت کی پہنائیوں میں
من و تو کی آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے

هست شب

هست شب یک شب دم کرده و خاک ،
رنگ رخ باخته است ۔
باد ، نو باوهٔ ابر ، از بر کوه ،
سوی من تاخته است ۔

هست شب ۔ همچوم ورم کرده تنی ، گرم در استاده ہوا ۔
هم از این رو است نمی بیند اگر گمشده ای راهش را ۔

با تنش گرم ، بیابان دراز ،
مرده را مانده در گورش تنگ ۔
بدل سوختهٔ من مانند ،
بتنم خستہ کہ می سوزد از هیبت تب !
هست شب ۔ آری ، شب ۔

بے شک ہے رات

بے شک ہے رات ـــــ ایک گھٹی ہوئی رات ۔
اور مٹی کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا
ہوا ، گھٹاؤں کی نوجوان بیٹی ، پہاڑ سے اتر کر
مجھ پر دوڑی چلی آ رہی ہے

بے شک رات کسی سوجے ہوئے بدن کے مانند ، اور ہوا
گرم ، رکی ہوئی

اسی لیے کوئی بھولا ہوا مسافر اپنا راستہ نہیں پا سکتا

یہ طویل بیاباں جس کا بدن پھنک رہا ہے
اپنی تنگ قبر میں پڑے ہوئے مردے کے مانند ہے

یا جیسے میرا ہی دل ، جھلسا ہوا دل
میرے ہی تھکے ہوئے جسم میں ، جو بخار کی شدت سے جل رہا ہے
بے شک رات ہے ، بے شک !

ماخ اولا

"ماخ اولا" پیکره ی رود بلند
می رود نامعلوم
می خروشد هر دم
میجهاند تن ، از سنگ به سنگ ،
چون فراری شده ی
(که نمی جوید راه هموار)

می تند سوی نشیب
می شتابد به فراز
می رود بی سامان ،
با شب تیره ، چو دیوانه که با دیوانه -

رفته دیری ست به راهی کاوراست ،
بسته با جوی فراوان پیوند
نیست - دیری ست - بر او کس نگران
و اوست در کار سراییدن گنگ
و او فتاده ست ز چشم دگران
بر سر دامن این ویرانه

با سراییدن گنگ آبش
ز آشنایی "ماخ اولا" راست پیام

وز رہ مقصد معلومش حرف۔
می رود لیکن او
بہ ہر آن رہ کہ بر آن می گذرد
ہمچو بیگانہ کہ بر بیگانہ

می رود نامعلوم
می خروشد ہردم
تا کجاش آبشخور
ہمچو بیرون شدگان از خانہ۔

ماخ اولا[1]

"ماخ اولا" ، دریا کا عظیم پیکر
اندھا دھند چل رہا ہے
ہردم شور مچاتا ہوا
ایک ایک کر کے پتھروں پر اپنا جسم پٹختا ہوا
کسی مغرور کے مانند
(جو سیدھے راستوں سے کترا کر چلتا ہے)
نشیب کی طرف گھومتا ہوا
فراز کی طرف دراتا ہوا
اندھیری رات کے ساتھ بے سروسامان چلتا ہوا
جیسے دیوانہ ، چلے دیوانے کے ساتھ

1۔ "ماخ اولا" ایک دریے کا نام ہے ، یوش کے لڑکپن۔ لبا یہاں سے ہر سال گذرتا اور دم بھر کے لیے سستا لیا کرتا تھا۔

ایک مدت سے اپنی ہی راہ چلا جا رہا ہے
کئی بھری ندیوں کے ساتھ اپنا پیمان باندھے ہوئے
نہیں ، مدت سے اسے کوئی دیکھنے والا نہیں
اور اس کا کام ہے چپ چاپ گانا
وہ اوروں کی نظروں سے گر کر
اس ویرانے کے دامن میں پڑا ہے

اپنے گونگے گیت کے ذریعے ، یہ دریا
ماخ اولا کو آشنائی کا پیغام دیتا ہے
اور اپنی منزلِ مقصود کی بات سناتا ہے
لیکن وہ اپنے راستے پر برابر چلا جا رہا ہے
جیسے بیگانہ گذرے ، بیگانے کے پاس

اندھادھند چلا جا رہا ہے
ہردم شور مچاتا ہوا
اس کا گھر گھاٹ کہاں ہے ؟
وہیں جہاں ان لوگوں کا گھر گھاٹ ہوتا ہے
جو گھر بار چھوڑ کر نکل گئے ہوں

فریاد میزنم[۱] (قایق)

من چهره ام گرفته ،
من قایقم نشسته به خشکی ۔
با قایقم نشسته به خشکی ،
فریاد می زنم :
"وامانده در عذابم انداخته ست ،
در راه پر مخافت این ساحل خراب ،
و فاصله ست آب ،
امدادی ای رفیقان با من"
گل کرده است پوز خندشان اما
بر من ،
بر قایقم که نه موزون ،
بر حرف هایم در چه ره و رسم ،
بر التهابم از حد بیرون ۔

در التهابم از حد بیرون ،
فریاد بر می آید از من :

۱ ۔ غالباً راشد صاحب نے جب اس نظم کا ترجمہ کیا تھا ، اس وقت کسی ادبی مجلے میں یہ "قایق" کے نام سے چھپی ہوگی ۔ لیکن بعد ازاں ان کے مجموعۂ اشعار مرتبہ ڈاکٹر جنتی عطائی میں "فریاد میزنم" کے نام سے چھپی ہے ۔ (آفتاب اصغر)

"در وقت مرگ که با مرگ
جز بیم نیستی و خطر نیست ،
هز الی و جلافت و غوغای هست و نیست ،
سهو است و جز به پاس ضرر نیست ."

با سهو شان ،
من سهو می خرم .
از حرف های کاشکن شان .
من درد می برم .
خون از درون دردم سر ریز می کند !
من آب را چگونه کنم خشک ؟

فریاد می زنم ،
من چهره ام گرفته ،
من قایقم نشسته به خشکی ،
مقصود من ز حرفم معلوم بر شماست :
یکدست بی صداست ،
من ، دست من کمک ز دست شما می کند طلب .

فریاد من شکسته اگر در گلو ، وگر
فریاد من رسا ،
من از برای راه خلاص خود و شما ،
فریاد می زنم .
فریاد می زنم !

کشتی

میرا چہرہ اداس
اور میری کشتی ریتی پر

ریتی پر بیٹھی ہوئی یہ کشتی لیے
میں پکار رہا ہوں :
"اس نے مجھے ، کسی عذاب سے نڈھال ،
یہاں لا ڈالا ہے اس سنسان کنارے پر
اس پُر ہول راستے میں
اور یہاں فاصلہ پانی ہے
میری مدد کرو ، اے دوستو ! "

لیکن اُن کے تمسخر کے پھول کھل اٹھے ہیں
وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں
میری کشتی پر ، جس کی حالت چنداں اچھی نہیں ،
میری باتوں پر ، جن کا کوئی سر پیر نہیں
اور میرے اضطراب پر ، جو حد سے بڑھ گیا ہے

اپنے اس اضطراب میں ، جو حد سے بڑھ رہا ہے
میرے دل سے فریاد اٹھ رہی ہے :
"موت کے وقت (اور موت کے اندر
فنا ہونے کے خوف و خطر کے سوا کچھ نہیں)
پست و بود کا مسخرہ پن ، بازاری پن ،
اور شور و غوغا ، محض بُھول ہے
اور اس بُھول میں ضرر کے سوا کچھ نہیں" ۔

میں تمھاری اس بُھول کے ساتھ خود بھی بھولتا جا رہا ہوں
اور تمھاری حوصلہ شکن باتوں کا دکھ سہہ رہا ہوں
میرے دُکھوں سے لہو بہنے لگا ہے
میں اس پانی کو کیسے خشک کروں؟ کیسے؟

میں فریاد کر رہا ہوں
میرا چہرہ اُداس ہے
میری کشتی خشکی پر بیٹھ گئی ہے
میری باتوں کا مطلب تم پر روشن ہے
ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی
مَیں — میرا ہاتھ، تمھارے ہاتھ سے مدد کا طالب ہے

میری فریاد میرے گلے میں اٹک گئی ہو
یا دور تک پہنچ رہی ہو
مَیں تمھاری اور اپنی نجات کی خاطر فریاد کر رہا ہوں
فریاد کر رہا ہوں۔

فریدون تولّلی

شیراز میں ۱۹۱۹ع میں پیدا ہوئے۔ تہران یونیورسٹی کے شعبۂ آثار قدیمہ کے فارغ التحصیل ہیں اور آج کل پہلوی یونیورسٹی شیراز میں ملازم ہیں۔ فارس اور خوزستان کے صوبوں میں آثار قدیمہ کی دریافت اور تحقیق کے سلسلے میں اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اُن کی تصانیف میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں: "التفاصیل" (۱۹۴۵ع) اور "کاروان" جو پرانے رنگ کے اشعار پر مشتمل ہیں۔ "نافہ" (۱۹۶۲ع) جو نئے رنگ کی نظموں کی حامل ہے۔ "پویہ" (۱۹۶۶ع) جس میں غزلیں اور نظمیں ہیں، لیکن مضامین کی تازگی اور الفاظ کا انتخاب نیا ہے۔ اور "رہا" (۱۹۶۷ع) جس میں سب نظمیں نئے رنگ کی ہیں اور جس کی بعض نظموں کا ترجمہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر آربری مرحوم نے انگریزی میں کیا ہے۔ بعض نظموں کے روسی، عربی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ترجمے چھپ چکے ہیں۔ موجودہ مجموعے کی تینوں نظمیں "رہا" سے ماخوذ ہیں۔

کوی مردگان

بگذار و بگذر از سر این راز سینه سوز
کاین اژدر سیاه
پیچان ز سنگسار گرانبار سال و ماه
در جستجوی راه فروبسته‌ٔ گریز
بس نیش آتشین که بدل میزند هنوز

پیداست از نگاه تو ای فتنه کاین سخن
در جام راز نوشِ تو دردیست ناگوار!
بگذار و بگذر از سرِ این راز سینه سوز
کاین جانِ مهرپوش چه شبها که تا بروز
سیلاب خون گریسته برخاک آن مزار.

بینم که باز چشم تو، این چشم کنجکاو
میکاود از نگاه من، این راز خفته را
آن به که باز گویم و بگشایم آشکار
پیش تو این فسانه‌ٔ هرگز نگفته را

آنشب زدشت باخترا، باد، بیدرنگ
میکوفت گرم و چیره بر آن قلعه‌ٔ بلند.
وز بقعه، بر کرانه‌ٔ شا اور دیر سال
فانوس دانیال
بالرزشی نژند
میتافت بر سپیدیِ مهتابِ نیمرنگ

در پیشگاه چادر ما ، کوی مردگان
با گور های سرد
باساز و برگ مرگ
با توشه های پهنه پرجوش رستخیز
گسترده بود بر سر آن تپه خموش ،
. . . .
بر بامهای شوش .

آنشب ، زهشت ظلمت پس قرنهای دور
میتافت ماه ، برسر این راز دیرباز !
وندر شرار گرم هوس ، باستانشناس
بی هیچ شرم و پاس
بگرفته بود پرده ازین کاروان راز !

فرسوده از گشودن آن وادی خموش
یاران من فروشده چون مردگان بخواب
من پیش خیمه بر سر سنگی ، براه باد
بنشسته زار وخسته ، در آغوش ماهتاب
مانا بانتظار کسی جان دردمند
میسوخت در تنور فروزندهٔ نیاز
"این کیست ، اینکه در خم آن گیسوی بلند
نادیده ، بسته گردن جانم زدیرباز !"

جغدی کشید شیون و گفتی غریو مرگ
پیچید در سراسر ویرانه های دشت

وانگاه از درون یکی سهمگین مغاک
بانگی درشتناک
چون بانگ بهمنی که در افتد ز کوهسار
یا معبدی کهن که فرود آیدش حصار
یا تندری شگفت
آمد بگوش و خاست زنی مرده از مزار !

گیسو فشاند مست و چوباری بانتظار
هر سو بدشت خفته بکاوید و خیره گشت
بر من فکند چشم و تو گفتی از آن نگاه
بس چشمه های مهر
جوشید از نهانگهِ این جان پر گناه

"این اوست ، اوست کز پس بس قرن دیر پای
بگشاده چهره بر من و بشکفته زین مزار !
این آشنای جان من آن نقش آرزوست
کاین جان پاک دست
بسیار گشت و باز ندیدش بروزگار !

زن ، نرم پیش من شد و من در شرار شوق
آغوش آتشین بگشودم بر او ز مهر
لیک از فسون پنجهٔ آن عشق گور خیز
سوزان و دردناک
پاشید پیکرم چو کلوخی گران بخاک

او تافت روی و روح من اندر پیش خموش
میرفت بر کرانهٔ آن شیب ِ دور دست .

باز ایستاد ناگه و پس در یکی مزار
گوری غمین و تار
لختی فگند چشم و بمن گفت اشکبار :
" کاین استخوان تست کز آن روزگار دور
بر جای مانده در دل این سالخورده گور ! "

"ای بس شبان ، که تنگ بدین پیکرت زمهر
افشرده ام بسینه در آن ژرف روزگار
وین جان بیقرار
بازت چو دیرباز
پر شور ، میپرستد و میجوشد از نیاز ! "
من تافتم به پیکر و آن تخته بند مرگ
آن استخوان سرد
در تیره جای خویش بجنبید و جان گرفت .
آویختم در آن مه و لختی نرفته باز
بنشست ماه و دامن ار آن خاکدان گرفت .

ز آن پس ، ندانم آنچه بما رفت تا بروز
این دانم آنکه او شد و خورشید شد فراز .
من ، مست و هوشباخته ، از سرگذشت دوش
در پای آن کلوخ پریش آن تن خموش

در هیکل شگفت مغی مات و بیمناک
باز ایستاده بر سرِ آن پشته های خاک!

مُردوں کی گلی

اِس راز کا ، اِس سینہ جلا دینے والے راز کا پیچھا نہ کر
اس راز کو بُھول جا
یہ کالا ناگ جو ماہ و سال کے سنگین پتھراؤ سے
پیچ و تاب کھا رہا ہے
اور فرار کے بند راستے ڈھونڈھتا ہے
اس کے دل میں اب تک کئی ڈنک باقی ہیں

اے فتنے ، میں تیری نظروں سے جان گیا ہوں
کہ میری یہ بات تیرے اس پہلے میں
جس سے تو راز کی شراب پیتا ہے ، محض تلچھٹ ہے ، ناگوار
اس راز کا پیچھا نہ کر، اس سینہ جلا دینے والے راز کو بھول جا
میری جان ، میری محبت کی ماری جان
اس مزار کی خاک پر کئی راتیں
خون کے سیلاب رو چکی ہے

میں دیکھ رہا ہوں تیری آنکھیں ،
ہر بات کی تہہ تک پہنچنے والی آنکھیں ،
میری آنکھوں کے اندر اس سوئے ہوئے راز کو پھر سے کرید
رہی ہیں

تو بہتر ہے کہ میں یہ راز کہہ ڈالوں
یہ اَن کہی داستان تجھے سنا ہی ڈالوں :

اُس رات جب مغرب کے میدانوں سے آتی ہوئی ہوا
بے روک ٹوک اُس اونچے قلعے کی دیواروں پر پے در پے
زور زور سے تھپتھپا رہی تھی
اور اوڑھے شاور[1] کے کنارے ، اس جھونپڑے میں
دانیال کا چراغ
ایک افسردہ لو کے ساتھ
مدّھم چاندنی کے اجالے پر حملہ کر رہا تھا

میرے خیمے کے سامنے دور دور تک ، مُردوں کی گلی ،
جس کے اندر ٹھنڈی قبریں
جس کے اندر موت کا سازو سامان
جس کے اندر حشر کے پُر شور میدان کی سوغاتیں
اس سنسان ٹیلے کے اوپر پھیلی ہوئی تھی
اور ادھر شوش[2] کی چھتوں پر مردے
گہری نیند سو رہے تھے

اُس رات ، کتنی دور کی صدیوں کی تاریکی کے پیچھے سے
چاند اس پرانے راز پر چمک رہا تھا
اور ایک آثارِ قدیمہ کا ماہر اپنے ذوق و شوق کی آگ میں
جلتا ہوا

---

۱ ۔ شاور : دریا کا نام ۔

۲ ۔ شوش : قدیم شہر جو دفن ہو چکا تھا ۔

کسی شرم و لحاظ کے بغیر
اس راز کے کاروان سے پردہ ہٹا رہا تھا

اس سنسان وادی کی پردہ کشائی سے اُکتا کر
میرے دوست مُردوں ہی کے مانند گہری نیند سو گئے تھے
اور میں خیمے کے آگے، ہوا کی گزرگاہ میں، چاندنی کے
آغوش میں،
افسردہ اور چور، ایک پتھّر پر بیٹھا ہوا تھا

جیسے کوئی دردمند ہستی، کسی کے انتظار میں،
تمنّا کے دہکتے ہوئے تنّور کے اندر جل رہی ہو
"یہ کون ہے؟ جس نے اپنی لمبی زلفوں کے خم میں
ایک زمانے سے میری جان کی گردن بے جانے بوجھے
لپیٹ رکھی ہے؟"

کسی اُلّو نے چیخ ماری اور یوں سمجھو
جیسے موت کی چنگھاڑ میدان کے کھنڈروں میں
چاروں طرف پھیل گئی ہو
پھر ایک خوفناک گڑھے سے ایک تیز آواز،
پہاڑوں پر سے گرتے ہوئے تودوں کے مانند،
کسی پرانے معبد کی گرتی ہوئی دیوار کے مانند،
کانوں میں آئی
اور ایک مردہ عورت مزار سے اُٹھ کھڑی ہوئی

اُس نے مستانہ اپنے گیسو جھٹکائے
اور جیسے کوئی محبوب عاشق کے انتظار میں ہو
اُس نے اس سوئے ہوئے میدان میں چاروں طرف نگاہ ڈالی
اور پھر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی
اُس نے میری طرف دیکھا ، اور یوں کہو کہ اُس ایک نگاہ سے
اس گنہگار دل کے نہاں خانوں میں
محبت کے کئی چشمے اُبل پڑے

''یہ وہی ہے ، وہی ، جس نے بے شمار صدیوں کے بعد آج
میرے سامنے اپنے چہرے سے نقاب الٹی ہے
جو اس مزار سے پھول کے مانند کھِل اٹھی ہے
یہ میرے دل کی رازدار ، یہ میری آرزوؤں کا وہ نقش ہے
جس کی تلاش میں میری پاکیزہ جان سرگرداں رہی ہے
لیکن اُسے دوبارہ زمانے میں کہیں نہیں پا سکی ۔''

عورت آہستہ سے آگے بڑھی اور میں نے اپنے شوق کی جلن میں
اپنا محبت سے گرم آغوش اُس کے لیے وا کردیا
لیکن اُس قبر سے طلوع ہونے والے عشق کے پنجوں کے
دہکتے ہوئے اور دردناک جادو نے
کسی مٹی کے بھاری ڈھیلے کے مانند
میرے جسم کو پاش پاش کر دیا

اُس نے منہ پھیر لیا اور میری جان چپ چاپ
اُس کے پیچھے ، اُس دور تک پھیلے ہوئے نشیب کے کنارے

کنارے چل دی

وہ اچانک رکی اور پھر ایک مزار کے اندر، ایک غم زدہ اداس
قبر کے اندر،

اس نے جھانک کر دیکھا — وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی
اور مجھ سے کہنے لگی:

"یہ تیری ہی ہڈیاں ہیں، جو اس دور دراز زمانے سے
اس بوڑھی قبر کے اندر بچ گئی ہیں!"

"ہائے وہ راتیں، جو میں نے زمانے کے اِس پاتال میں
تیری محبت کی خاطر، تیرے جسم کو اپنے سینے سے لگائے
ہوئے
گزار دیں
اور یہ مضطرب جان
اب بھی بدستور تڑپ رہی ہے
تجھے پوجتی ہے، اور تیری ہی تمنّا میں گھل رہی ہے"

میں اِس پیکر کی طرف بڑھا، لیکن وہ موت کی زندانی،
وہ ٹھنڈی ہڈیاں،
اپنی تاریک جگہ پر ہلیں اور ان میں جان پڑ گئی
میں تھوڑی دیر اِس چاند کے ساتھ لپٹا رہا، لیکن جلد ہی
چاند ڈوب گیا اور اِس خاکدان سے اپنا دامن کھینچ کر
چل دیا

اِس کے بعد — مجھے کچھ نہیں معلوم دن بھر ہم پر کیا گزری
بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ چلی گئی اور سورج نکل آیا

اُس رات کے ماجرا سے میں مبہوت اور میرے ہوش و حواس گم
اور میرا خاموش جسم اس بکھرے ہوئے ٹیلے کے نیچے
کسی آتشکدے کے نگہبان کے عجیب ہیکل کے مانند
حیرت میں کھویا ہوا ، خوف سے سہما ہوا ،
پھر وہیں ، اُنھی مٹی کے ڈھیروں کے اوپر کھڑا تھا ۔

درهٔ مرگ

دور شو ! دور ازین راه تباه !
شام ، خونین شد و خورشید نشست
تو چه دانی که درین درهٔ پُر شیب و شکست
این هیولای سیاه
چیست کاویخته از دور براه تو نگاه .

چه هوسهای فروزنده و اُمید دراز
که فرو مرده و پوشیده در این دشت خموش
وندر آن تیره مغار
ای بسا شیههٔ اسبان و هیاهوی سوار
که بپیچیده ولختی دگر افتاده ز جوش !

دور ! ای خسته ، از این راه تباه
شب فرود آمد و لغزید بکوه .
سایه پیوست بتاریکی و زآن راه دراز
باز ، آن شیون راز
باز ، آن بانگ ستوه
بانگ آن زخمی گمگشته بپا خاست ز گودال سیاه !

پای آن تپه ، در آن بیشه ، از آن شبرو کرم
ای بسا اخگر سوزان که فرومانده بجای .
کاروانها زده اندر خم این گردنه دزد
چشم ، کاوان بره و گوش بآهنگ درای !

دور شو از دلِ این دره که این کوه فسون خیز بلند

راز ها دارد از آن کهنه هراس .
خسته از تاب شکیب
ای بسا غول فریب
که در آن گوشه نشستست براه تو بپاس !

دور شو دور ، که دو سینهٔ آن چشمهٔ خشک
گرزه مارست که چنبر زده بر دامن سنگ
تشنهٔ جان تو تا ازین دندان ستیز
بیکی گام ، فرود و شنشان با رشرنگ !

پای چالاک کن ، این سایهٔ اوست !
نقش آن اهرمنست اینکه در افتاده بسنگ
نه شکیب و نه درنگ
زود بشتاب و برون آی ازاین درهٔ تنگ

تند بگریز و مپای ، این نه گذاریست که مرد
اندر آن سست کند پای شتاب
تند بگریز و مپای .
چیست ای رهگذر این سایه که چالاک چو گرد
میشتابد ز پیت از دل این راه سپید ؟
وای بر جان تو وای
رهگذر ! دیو رسید !

موت کی وادی

دور ہو جا ، اس اجڑے راستے سے دور
شام ، لہو سے بھرگئی اور سورج ڈوب گیا

تجھے کیا معلوم کہ اس اونچی نیچی وادی میں
یہ سیاہ موہوم صورت کیا ہے ؟
جو راستے میں دور سے تجھے گھور رہی ہے ؟

کیسی کیسی دہکتی ہوئی آرزوئیں ، کیسی کیسی لمبی امیدیں
اس سنسان میدان میں بجھ کر رہ گئیں ، اُن کے پرزے اُڑ گئے
اور اس تاریک غار میں
کتنے گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور کتنے سواروں کی ہا و ہو
ایک دفعہ بلند ہوئی اور پھر اُس کا جوش سرد پڑ گیا

دور ہو جا ، اس اجڑے راستے میں رات
تھکی ہاری لڑکھڑاتی ہوئی پہاڑ سے اتر آئی ہے
سایے اندھیروں کے ساتھ مل گئے ہیں اور اس لمبے راستے میں
پھر ایک چھپا ہوا نالہ ، ایک دلدوز صدا ،
ایک راہ سے بھٹکے ہوئے زخمی کی صدا
کسی تاریک گڑھے سے اُٹھ رہی ہے

اس ٹیلے کے نیچے ، اس جنگل میں ، اس راتوں کو نکل کر
دوڑنے والے کی نشانی ،
کئی سلگتے ہوئے کوئلے رہ گئے ہیں
چور نے اس تنگ راستے کے موڑ میں ، کئی کاروان لوٹ ڈالے ہیں
اور اب بھی اُس کی نظریں راستے کو کرید رہی ہیں
اور اُس کے کان آنے والے کاروانوں پر لگے ہوئے ہیں

دور ہو جا ، اس وادی سے
کہ اس عظیم جادو کے پہاڑ کے اندر

ہزاروں ہراس خوف چھپے ہوئے ہیں
اور فریب کے کئی غول انتظار میں چور
کسی گوشے میں گھات لگائے تیری راہ تک رہے ہیں

قدم تیز بڑھا ، یہ اسی کا سایہ ہے
اسی اہرمن کا نقش ہے جو پتھر پر رہ گیا ہے
انتظار نہ کر ، مت ٹھہر !
جلدی کر ، اور اس تنگ وادی سے باہر نکل جا !

تیز دوڑ ، مت رک ، یہ ایسا راستہ نہیں کہ مرد
اس میں پاؤں پسار کر بیٹھ جائے
تیز بھاگ اور مت ٹھہر !
یہ راہرو کون ہے ، یہ سایہ کس کا ہے ؟
جو غبار کے مانند تند و تیز اڑھ رہا ہے
اور اس سنسان راستے سے تیرے پیچھے بھاگتا چلا آ رہا ہے
افسوس ! تیرے حال پر افسوس !
اے مسافر ! دیو آ پہنچا ، دیو !

گنهکار

دل من چنگ افسونست و هر عشق
در آن بنهاده از خود یادگاری
ز هر مهری در او افسرده یادی
ز هر موئی بر او پیچیده تاری

زر افشان ، پُر گره ، شبرنگ ، بی تاب
بهم پیوسته بس گیسو درین چنگ
خُمُش ، در انتظار زخمهٔ سوز
که تا خود راز ها گوید باهنگ

شبانگاهان که در تنهائی سرد
بدامن گیرم این ساز کهن گوی
بزیر لغزش نرم سر انگشت
هزاران یاد خوش خیزد ز هر موی

فضای خانه لرزد آنچنان گرم
که زیبا کودکانم بر سرآیند :
"پدر ! این چیست ، این بانگ دلاویز
که در کاشانهٔ ما میسرایند ؟ !"

زنم از گوشهٔ دیگر کشد بانگ
که بس کن مرد ، زین هنگامه بس کن !

نہ ہر نائی دگر با این دو فرزند !
بدین پیرانہ سر، ترکِ ہوس کن !

ولی من دور ازآن اندرز بیگاہ
دو گوشم بر سروش آسمانہاست
دو چشمم خیرہ چون کوران و زان یاد
شرار آتشم بر استخوانہاست !

گنہگار

دل میرا جادو کا ستار ہے اور ہر عشق اس کے اندر
اپنی کوئی یادگار چھوڑ گیا ہے
ہر محبت کی بجھی بجھی سی یاد اس میں باقی ہے
اور ہر زلف کا کوئی بال اس کے گرد اپنے تار لپیٹ گیا ہے

سنہرے، الجھے ہوئے، سیاہ تاب، بے قرار،
کئی گیسو اِس ستار میں الجھ کر رہ گئے ہیں
اور ستار کسی درد کے مضراب کے انتظار میں چپ ہے
تا کہ اپنے راز پھر سے الاپ سکے

رات گئے، جب میں سرد تنہائی میں
پرانی کہانیاں کہنے والے اس ساز کو اٹھاتا ہوں
تو میری انگلیوں کے سروں کی ہلکی ہلکی چھیڑ سے
اِس کے ہر ہر بال سے ہزاروں خوب صورت یادیں جاگ اٹھتی ہیں
گھر کی فضا گرما کر کانپ اٹھتی ہے
میرے پیارے پیارے بچے جاگ اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں :

"ابّا ! یہ کیا ہے ؟ یہ پیاری پیاری آواز ؟
جس میں کوئی ہمارے گھر کے اندر گا رہا ہے ؟"

اور دوسرے کونے سے میری بیوی پکار اٹھتی ہے
"اے میاں ! یہ شور شرابا بند کر !
اِن دو بچوں کے ہوتے
تو اب کون سا جوان رہ گیا ہے
باز آ ، اِس بڑھاپے کی ہوس سے باز آ !"

لیکن میں اِس بے محل نصیحت سے دور
آسمانوں کے پیغام پر کان لگائے بیٹھا ہوں
میری آنکھیں اندھوں کی آنکھوں کی طرح بند ہیں
اور اُس یاد سے آگ کی ایک گرم گرم چنگاری
میری ہڈیوں پر آن گرتی ہے ۔

احمد شاملو

(ا - بامداد)

تہران میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے - والد فوجی افسر تھے - ان کی پے در پے تبدیلیوں کی وجہ سے تعلیم بے قاعدہ رہی اور بمشکل دسویں جماعت پاس کر سکے - بعض سیاسی اور غیر سیاسی وجوہ سے دو تین مرتبہ جیل جا چکے ہیں - کئی ہفتہ وار اخباروں اور ماہانہ رسالوں میں کام کیا ہے - آج کل ترجمہ و تالیف کے علاوہ، ایران کی دیہاتی زندگی کے بارے میں ٹیلی وژن کے لیے فلم تیار کرتے ہیں - شعری مجموعوں میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں: ''آهن ها و احساس''، هوائے تازہ''، ''باغ آئینہ''، ''آیدا در آئینہ''، ''لحظہ و همیشہ''، ''آیدا، درخت، خنجر و خاطرہ''، ''ققنوس در باران''، ''مرثیہ هائے خاک'' اور ''از هوا و آئینہ ها'' وغیرہ - ان میں سے اکثر کے دو دو تین تین اڈیشن نکل چکے ہیں - ان کے علاوہ نظموں کے دو انتخابات اور مترجمہ نظموں کا ایک مجموعہ ''خورشید در مرداب'' چھپ چکا ہے - افسانوں کے دو تین مجموعے بھی بازار میں آ چکے ہیں - بعض قدیم شاعروں کے دواوین بھی مرتب کیے ہیں - اور دوسری زبانوں سے سترہ اٹھارہ ناول ترجمہ کیے ہیں - متعدد ڈرامے اور بچوں کے لیے کتابیں بھی ان کے قلم سے ہیں - اس مجموعے کے لیے نظمیں ''هوائے تازہ'' اور ''آیدا در آئینہ'' سے انتخاب کی گئی ہیں -

آیدا در آینه

لبانت به ظرافت شعر
شهوانی ترین بوسه ها را به شرمی چنان مبدل می کند
که جاندار غار نشین از آن سود می جوید
تا به صورت انسان در آید ـ
و گونه هایت با دو شیار مورب
که غرور ترا هدایت می کنند و سر نوشت مرا
که شب را تحمل کرده ام
بی آنکه به انتظار صبح
مسلح بوده باشم ،
و بکارتی سربلند را
از روسبیخانه های داد و ستد
سر به مهر باز آورده ام . . .
هرگز کسی این گونه نجیع به کشتن خود بر نخاست
که من به زندگی نشستم !
و چشمانت راز آتش است
و عشقت
پیروزی آدمی است
هنگامی که به جنگ تقدیر می شتابد
و آغوشت

اندک جائی برای زیستن
اندک جائی برای مردن ،
و گریز از شهر ـ که با هزار انگشت ، به وقاحت
پاکی آسمان را متهم می کند . . .
کوه با نخستین سنگ ها آغاز می شود
و انسان با نخستین درد

در من زندانی ستمگری بود
که به آواز زنجیرش خو نمی کرد ـ
من با نخستین نگاه تو آغاز شدم ـ

توفان ها در رقص عظیم تو
به شکوهمندی
نی لبکی می نوازند
و ترانهٔ رگ هایت
آفتاب همیشه را طالع می کند ـ
بگذار چنان از خواب بر آیم
که کوچه های شهر
حضور مرا دریابند ـ

دستانت آشتی است
و دوستانی که یاری می دهند
تا دشمنی
از یاد
برده شود ـ

پیشانیت آینه‌ی بلند است
تابناک و بلند
که خواهران هنتگاند در آن می نگرند
تا به زیبائی خویش دست یابند ۔
دو پرندهٔ بی طاقت در سینه ات آواز می خوانند ۔
تابستان از کدامین راه فرار خواهد رسید
تا عطش
آب ها را گواراتر کند ؟

تا در آئینه پدیدار آئی
عمری دراز در آن نگریستم
من برکه ها و دریا ها را گریستم
ای پری وار در قالب آدمی
که پیکرت جز در خلوارهٔ ناراستی نمی سوزد !
حضورت بهشتی است
که گریز از جهنم را توجیه می کند ،
دریائی که مرا در خود غرق می کند
تا از همهٔ گناهان و دروغ
شسته شوم ۔

و سپیده دم بادست هایت بیدار می شود ۔

آیدا آئینے میں

تیرے ہونٹ جو لطافت میں شعر ہیں
بے حد شہوت انگیز بوسوں کو اس طرح حیا میں بدل دیتے ہیں

کہ کسی غار میں چھپا ہوا درندہ ، اس سے فائدہ اٹھا کر ،
انسان کا روپ دھار لے

اور تیرے رخسار جن پر دو آڑی لکیریں پڑی ہیں
تیرے غرور اور میری تقدیر کو راستہ دکھاتے ہیں
میں — جس نے رات برداشت کی ہے
بغیر اس کے کہ خود کو صبح کی امید سے مسلّح کروں ۔
میں اپنی پُر افتخار عصمت کو
داد و ستد کے فاحشہ خانوں سے
سر بمہر واپس لے آیا ہوں - - - -

کبھی کسی نے اپنے آپ کو اس طرح سفّا کانہ قتل کرنے کی
کوشش نہیں کی
جس طرح میں نے زندگی بسر کی ہے

اور تیری آنکھیں آگ کا راز ہیں
اور تیرا عشق
آدمی کی وہ فتحمندی ہے
جب وہ تقدیر کے ساتھ جنگ کرنے کو دوڑ پڑتا ہے
اور تیرا آغوش
ذرا سی جگہ ہے جینے کی ،
ذرا سی جگہ ہے مرنے کو ،
مگر شہر سے فرار ہے — اس شہر سے جو ہزاروں انگلیاں
اٹھانے بے شرمی سے

آسمان کی پاکیزگی پر تہمت باندھ رہا ہے۔
پہاڑ پتھر کے پہل کرنے سے شروع ہوتا ہے
اور انسان درد کی پہل سے

میرے اندر ایک ظالم قیدی رہا کرتا تھا
جو اپنی زنجیر کی جھنکار کا عادی نہ ہو سکا
میں تیری نگاہ کی پہل سے شروع ہوا

ہزاروں طوفان تیرے عظیم رقص کے اندر
بڑے جلال کے ساتھ بنسری بجا رہے ہیں
اور تیری رگوں کے ترانے
سدا کے سورج کو طلوع کرتے ہیں

مجھے اس طرح اپنے خوابوں سے جاگنے دو
کہ شہر کے سب گلی کوچے
میری موجودگی کی خبر پا لیں

تیرے ہاتھ ملاپ ہیں
اور ایسے دوست جو ہمیشہ ساتھ دیتے ہیں
تا کہ دشمنی یاد سے
محو ہو جائے

تیری پیشانی اونچا آئینہ ہے
تابناک اور بلند

جس کے اندر "سات بہنیں" اپنا منہ دیکھ رہی ہیں
تا کہ اپنے حسن تک رسائی پا سکیں

تیرے سینے کے اندر دو کمزور پرندے چہچہا رہے ہیں

گرمی کا موسم کس راستے سے آئے گا ؟
تا کہ پیاس
پانی کو اور بھی خوشگوار کر ڈالے ؟

اس لیے کہ شاید تو آئینے کے اندر نمودار ہو
میں تمام عمر آئینے کے اندر جھانکتا رہا ہوں
میں سب جھلیں ، سب سمندر رو چکا ہوں ۔

اے انسان کے قالب میں پری کی مثال !
جس کا بدن ناسچائی کی بھوبھل کے سوا کہیں نہیں جلتا
تیرا حضور بہشت ہے
جو جہنم سے فرار کا جواز ہے
ایسا سمندر ہے جو مجھے اپنے اندر ڈبو رہا ہے
تا کہ میں تمام گناہوں اور ہر جھوٹ سے
دھل کر پاک ہو جاؤں

اور — صبح کا اُجالا
تیرے ہی ہاتھوں کے ساتھ جاگتا ہے ۔

من مرگ را ...

اینک موج سنگین گزر زمان است که در من می گزرد۔
اینک موج سنگین گزر زمان است کہ چون جویبار آہن در من
می گزرد۔
اینک موج سنگین گزر زمان است کہ چولان دریائی از پولاد و
سنگ در من می گزرد۔

در گزرگاہ نسیم ، سرودی دیگر گونہ آغاز کردم
در گزرگاہ باران ، سرودی دیگر گونہ آغاز کردم
در گزرگاہ سایہ ، سرودی دیگر گونہ آغاز کردم

نیلوفر و باران در تو بود
خنجر و فریادی در من ،
فوارہ و رؤیا در تو بود
تالاب و سیاہی در من۔

در گزرگاہت سرودی دیگر گونہ آغاز کردم۔

من برگ را سرودی کردم
سرسبز تر ز بیشہ

من موج را سرودی کردم
پُر نبض تر از انسان

من عشق را سرودی کردم
پُر طبل تر ز مرگ

سرسبز تر از جنگل
من برگ را سرودی کردم

پُر تپش تر از دل دریا

مں موج را سرودی کردم
پُر طبل تر از حیات
من مرگ را
سرودی کردم۔

میں نے موت کو۔۔۔

یہ ہے زمانے کی بوجھل گزرتی ہوئی لہر، جو میرے اندر
گزر رہی ہے
یہ ہے زمانے کی بوجھل گزرتی ہوئی لہر، جو لوہے کی ندی
کے مانند میرے اندر گزر رہی ہے
یہ ہے زمانے کی بوجھل گزرتی ہوئی لہر، جو فولاد اور
پتھروں کے سمندر کے مانند میرے اندر گزر رہی ہے

میں نے نسیم کی گزرگاہ میں، ایک اور ہی طرح کا گیت آغاز
کیا ہے
بارش کی گزرگاہ میں، ایک اور ہی طرح کا گیت آغاز کیا ہے

ماہیوں کی گزرگاہ میں، ایک اور ہی طرح کا گیت آغاز کیا ہے

نیلوفر اور بارش تیرے اندر ہے

خنجر اور فریاد میرے اندر
فوّارے اور خواب تیرے اندر تھے
تاریکی اور تالاب میرے اندر
میں نے تیری گزرگاہ میں ، ایک اور ہی طرح کا گیت آغاز
کیا ہے
میں نے پتّے کو گیت بنا دیا
اور وہ جنگل سے زیادہ سرسبز ہو گیا ،
میں نے لہر کو گیت بنا دیا
اور وہ انسان سے زیادہ دھڑکنے لگی ،
میں نے عشق کو گیت بنا دیا
اور وہ موت سے زیادہ پُر شور ہو گیا ،
جنگل سے سرسبز تر ــــ
میں نے پتّے کو گیت بنا دیا ــــ
سمندر کے دل سے زیادہ بے قرار
میں نے لہو کو گیت بنا دیا
زندگی سے زیادہ پُر شور ہو گئی
میں نے موت کو
گیت بنا دیا ۔

احساس

سه دختر از جلوخان سرائی کهنه سیبی سرخ پیش پایم افکندند
رخانم زرد شد اما نگفتم هیچ
فقط آشفته شد یک دم صدای پای سنگینم به روی فرش سخت سنگ -

دو دختر از دریچه لاله عباسی گیسو های شان را در قدم های من افکندند
لبم لرزید اما گفتنی ها بر زبانم ماند
فقط از زخم دندانی که بر لب ها فشردم ، ماند بر پیراهن من لکه ئی نارنگ -

به خانه آمدم از راه ، پا پُر آبله ، دل تنگ و خالی دست
به روی بستر بی عشق خویش افتادم از اندوه گنگی مست
شب اندیشناک خسته از راه درازش می گزشت آرام -
کلاغی بر چناری دور ، در مهتاب زد فریاد -
درین هنگام
نسیم صبحگاه سرد ، بر درگاه خانه پرده را جنباند -
در آن خاموش رؤیائی چنان پنداشتم کز شوق ، روی پرده ، قلب دختر تصویر می لرزد -
چنان پنداشتم کز شوق ، پردم باتلاشی شوم و یأس آمیز خود را می کشد آرامک آرامک به سوی من . . .

دو چشمم خستہ برهم رفت ۔
سپیدہ می گشود آهستہ جعد گیسوان تابدار صبح ۔
سحر لبخند می زد سرد ۔

طلسم راج من پوشید
چنین احساس کردم من لبان مردہ ئی لب های سوزان مرا در
خواب می بوسید ۔

احساس

تین لڑکیوں نے ایک پرانی حویلی کے دروازے سے ایک سرخ
سیب میرے پاؤں میں پھینک دیا
میرے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ، لیکن میں نے کہا نہیں
کچھ !
صرف میرے پاؤں کی چاپ لڑکھڑا گئی ، پتھر کے سخت
سخت فرش پر

دو لڑکیوں نے دریچے میں سے اپنے بالوں کے گلِ عباسی میرے
قدموں میں پھینک دیے
میرے ہونٹ تھرتھرا اٹھے ، لیکن بات زبان پر آکر ہی رہ گئی
اور دانتوں کے کاٹنے سے جو زخم میرے ہونٹوں پر پڑ گیا تھا
اس کا ہلکا سا سرخ سرخ دھبا میری قمیص پر باقی رہ گیا ــــ

میں راستے سے گھر لوٹا ، پاؤں میں چھالے لیے ، اداس اور
خالی ہاتھ ،

ایک گونگے غم سے سرشار ، میں اپنے عشق سے سنسان بستر
پر گر پڑا

ایک سہمی ہوئی ، تھکی ہوئی رات آہستہ آہستہ اپنے سفر سے
لوٹ کر آ رہی تھی
دور ایک چنار پر بیٹھے ہوئے کوے نے چاندنی میں کائیں کی
آواز لگائی

اس وقت صبح کی ٹھنڈی ہوا نے ایک گھر کی دہلیز کا پردہ ہلایا
اس خواب ناک خاموشی میں میں نے جانا کہ شوق کے مارے
پردے کے اوپر تصویر والی لڑکی کا دل ہل رہا ہے
میں نے خیال کیا کہ وہ شوق کے مارے ہر لمحہ کسی منحوس
اور یاس انگیز کوشش کے ساتھ اپنے آپ کو آہستہ آہستہ
میری طرف کھینچے لا رہی ہے

میری دو تھکی ہوئی آنکھیں بند ہو گئیں
اجالے نے آہستہ آہستہ صبح کے چمکتے ہوئے بال کھولنا شروع
کر دیے
صبح ٹھنڈی ہنسی ہنس رہی تھی
میرے دکھ کا جادو ٹوٹ گیا تھا
میں نے یوں محسوس کیا جیسے کسی مردے کے ہونٹ ،
خواب میں ، میرے جلتے ہونٹوں کا
بوسہ لے رہے ہیں ۔

مه

بیابان را ، سراسر ، مه گرفتست

چراغ قریه پنهان است

موجی گرم در خون بیابان است

لب بسته

نفس بشکسته

در هذیان گرم مه عرق می ریزدش آهسته

از هر بند

بیابان را سراسر مه گرفته است (می گوید به خود عابر) :

سگان قریه خاموشند

در شولای مه پنهان ، به خانه می رسم - گل‌کو نمی داند -

مرا ناگاه

در درگاه می بیند - به چشمش قطره

اشکی بر لبش لبخند ، خواهد گفت :

بیابان را سراسر مه گرفته است . . . با خود فکر می کردم که

مه ، گر

همچنان تا صبح می پائید مردان جسور از

خفیه گاه خود به دیدار عزیزان باز می گشتند .

بیابان را

سراسر

مہ گرفتست

چراغ قریہ پنہانست ، موجی گرم در خون بیابان است ۔

بیابان ، خستہ لب بستہ نفس بشکستہ در ہذیان گرم مہ عرق

می ریزدش

(آهستہ از هربند . . .

کہر

بیابان میں چاروں طرف کہر چھا رہی ہے

گاؤں کے دیے اوجھل ہو گئے ہیں

ایک گرم لہر بیابان کے لہو میں بھر گئی ہے

بیابان — تھکا ہوا ،

خاموش ،

ہانپتا ہوا ،

کہر کے گرم ہذیان میں اس کے جوڑ جوڑ سے

پسینہ بہہ رہا ہے

"— بیابان میں چاروں طرف کہر چھا گئی ہے" (راہرو اپنے آپ سے کہتا ہے)

"گاؤں کے کتّے چپ ہیں

"میں کہر کا دوشالہ اوڑھے گھر پہنچوں گا ۔ گل کو[1] نہیں جانتی ۔

---

۱ - گل کو : عورت کا نام ہے

مجھے اچانک دہلیز پر دیکھ پائے گی ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو
کے قطرے اور ہونٹوں پر ہنسی ہوگی،

کہے گی :

"— بیابان میں چاروں طرف کہر چھا گئی ہے ۔ ۔ ۔ میں دل
میں سوچ رہی تھی کہ کہر،

اگر یونہی صبح تک چھائی رہی ، تو کیا بہادر لوگ
اپنی پوشیدہ

کمین گاہوں سے نکل کر اپنے پیاروں سے ملنے
لوٹ آئیں گے ؟"

بیابان میں چاروں طرف
کہر چھا رہی ہے
گاؤں کے دیے اوجھل ہوگئے ہیں ۔ ایک گرم گرم لہر بیابان
کے لہو میں دوڑ رہی ہے :
بیابان — تھکا ہوا — خاموش — ہانپتا ہوا کہر کے گرم ہذیان
میں اس کے جوڑ جوڑ سے
پسینہ بہتا ہوا ۔ ۔ ۔

اسماعیل شاهرودی

(آینده)

پیدائش دامغان میں ۱۹۲۵ع میں ہوئی ۔ اپنے تخلص "آینده" سے مشہور ہیں ۔ ابتدائی تعلیم دامغان میں ، اور ثانوی تعلیم دامغان اور شاہرود میں پائی ۔ تہران منتقل ہو کر کچھ عرصہ معلّم رہے اور ساتھ ساتھ تہران کے مدرسۂ فنون لطیفہ میں مصوّری کا فن سیکھا ۔ بی ۔ اے پاس کرنے کے بعد مختلف سکولوں میں پڑھاتے رہے اور "لغت نامۂ دهخدا" اور "فرهنگ معین" کی تدوین میں ہاتھ بٹایا ، جو فارسی کی نہایت جامع اور قابلِ اعتماد لغتوں میں شمار ہوتی ہیں ۔ چار سال علی گڑھ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد رہ چکے ہیں ۔ ایران واپس آکر یونسکو نیشنل کمیشن میں ملازمت اختیار کی اور آج کل وہیں کام کرتے ہیں ۔ دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں : "آخرین نبرد" اور "آینده" ، اور نظموں کا ایک انتخاب "برگزیدہ شعر ہای اسماعیل شاہرودی" کے نام سے ۔ موجودہ مجموعے کے لیے نظمیں مؤخرالذکر دو مجموعوں سے اخذ کی گئی ہیں ۔

آبی رنگ

برای بعضی هزار نفر
برای بعضی یکنفر
و برای بعضی دیگر
یکی از هزار نفر !

هزار ستاره که میدرخشد از درد
در یک آسمان از امید
روشن میکنند یک زمین را
که در آن
انسانها و رنگها شان
سایهٔ روشن زندگانی را
با خود میبرند
عشقهاشان را
با خود میکشند ـ
و من با عشقهایم ، که زاده است دردی را در خود ،
میدرخشم
و دردی را که یکنفر
یکی از هزار نفر
از هزاران هزار نفر

بمن نوشاند
مینوشم ـ
اما یکنفر مرد
که راه میرود ،
اما یکنفر مرد
که مینوشد
نمینوشد ـ
و نمینوشد انسان من
حتی جرعه ای از حرفهای نرگس را
(از شرابش را)
که آبی مست بر عشقهایم
و میسوزاند دردهایم را ـ
و من انسان یک درد !

انسان من که همیهٔ انگوری مست در تنور یک شرم
از شیار گزشته هاست
که فرو میرود
در خم حرفها
و میسازد خود را
(من یکنفر را

یکی از هزار نفر
از هزاران هزار نفر را !)

انسان من چه میداند که چه نوشیده است ؟
و نمیشناسد که زندگانی انسان درد من
پادزهری ست
برای زهر دردهائی که میچشم
در مذاق آرزویم .
و بار عشقی که میکشم
بر شانه های رنجم ،
تا بنوشم شرابی را
که سیراب میتواند کرد
شاید هزار نفر را
و حتماً یکی از هزار نفر را !
و نرگسی که دریا هاست در چشمان عشق من
چشمانش آبی ست
آبی ست
آبی ست . . .

دریاهاست
دریا ها آبی ست
و انسان من در آن ته نشین شده است .
و فسیل یک انسان
(انسان یک درد)
صدف یک دریاست .

که اینک قایقی آرام در آن میراند ـ
و صدای یک انسان است که میخواند:
(آهسته میخواند)

دیشب که چشم کور و پشیمانم
هر جا پی نگاه تو جویا بود
دیدم بچشم خویش جدائی را
در جایگاه فاصلهٔ ما بود

و قایق میراند
میراند
میراند ...

بجانبی که نمیداند
و دور میشود از بندرگاه
که چلچراغ در تالار آرزوی من است ـ
و سرگردان میبرد
انسان یک درد را
بسوی گردابی از توفان
(از من)
و من یک درد
با شرابها
با بارهای شانه ها
با عشقهای یک انسان

غرق میشود ـ
و نرگس غرق میشود
با قایقی که میراند ـ
انسان همچنان میخواند :
(آهسته میخواند)

ماندی ز راه و باز نمیمانم
میبینی ـ ای فریب ! براه تو ـ
تا لحظه ای که تاب و توانم هست
گیرم سراغ جای نگاه تو !

و با او فرو میرود
در اندیشهٔ شاید هزار نفر
و در اندیشهٔ حتماً . یکی از هزار نفر
از هزاران هزار نفر !
انسان درد من غرق شده است ـ
و نرگس غرق شده است
در اندیشه ها
در دریا ها
(در دریاها و چشمها
دریاها و چشمها آبی ست
آبی ست
آبی ست
آبی ست . . .

و من یکنفر
یکی از هزار نفر
از هزاران هزار نفر ـ

غرق شده ام
با دردهایم
با شرابهایم
با دریا هایم
و با عشقهایم !

نیل رنگ

بعضوں کے لیے ہزار ،
بعضوں کے لیے ایک ،
اور دوسرے بعضوں کے لیے ،
ہزاروں میں سے ایک

ہزاروں دکھ کے بنے ہوئے ستارے، امید کے بنے ہوئے آسمان میں
جھلملاتے ہوئے
ایک زمین کو روشن کر دیتے ہیں
جس کے اندر
انسان اور ان کے رلگ
زندگی کی دھوپ چھاؤں کو ساتھ لیے

چلے جا رہے ہیں
اپنے عشقوں کو
اپنے ساتھ کھینچے لیے جا رہے ہیں :
اور میں اپنے عشقوں کے ساتھ ، جنھوں نے
اپنے اندر ایک دکھ کو جنم دے رکھا ہے
چمک رہا ہوں
اور اس دکھ کو جو ایک نے
ہزاروں میں سے ایک نے
لاکھوں میں سے ایک نے
مجھے پلایا
میں پیے جا رہا ہوں ۔
لیکن ایک شخص
جو راہ چل رہا ہے
لیکن ایک شخص
جو پی رہا ہے
اور نہیں پی رہا ۔
اور میرا انسان بھی نہیں پی رہا
نرگس کی باتوں کا ایک گھونٹ تک
(اس کی شراب کا)
جو میرے عشق کے اوپر پانی ہیں
اور میرے دکھ کو اور جلاتی ہیں
اور میں ایک دکھ کا انسان

میرا انسان کہ انگور کا ایندھن ہے ، کسی شرم کے تنور میں
ماضی کی لکیروں پر چلتا ہوا
باتوں کے مٹکوں کے اندر
ڈوبتا چلا جا رہا ہے
خود کو شکل دیتا جا رہا ہے
(مجھ ایک کو ،
مجھ ہزاروں میں سے ایک کو ،
مجھ لاکھوں میں سے ایک کو)

میرا انسان کیا جانے اس نے کیا پیا ہے ؟
اور نہیں جانتا کہ میرے دکھ کے انسان کی زندگی
تریاق ہے
ان دکھوں کے زہر کا جو میں
اپنی آرزوؤں کے ذوق کی خاطر چکھ رہا ہوں ۔

اور اس عشق کے بوجھ کا ، جو میں اپنے دکھ کے کندھوں پر
اٹھائے لیے جا رہا ہوں
تا کہ ایسی شراب پی سکوں
جو سیراب کر سکے
شاید ہزاروں کو
اور یقیناً ہزاروں میں سے ایک کو !
اور وہ نرگس جو میرے عشق کی نظروں میں
ہزاروں سخندر ہے

اس کی آنکھیں نیلی ہیں
نیلی ہیں
نیلی ہیں...
سمندر ہیں

سمندر نیلے ہیں
اور میرا انسان ان کے اندر ڈوب چکا ہے
اور ایک انسان کا تحیّر
(ایک دکھ کے انسان کا)
ایک سمندر کی سیپی ہے
جس کے اندر ایک کشتی (اے لو!) آہستہ آہستہ چل رہی ہے
اور ایک انسان کی آواز ہے جو گا رہی ہے
(آہستہ آہستہ گا رہی ہے) :

کل رات جو میری اندھی شرمائی آنکھیں
ہر سو تیری آنکھوں ہی کو ڈھونڈھ رہی تھیں
آنے والی جدائی کی زہریلی راتیں
دور سے ہم کو دوری بن کر دیکھ رہی تھیں
اور کشتی چل رہی ہے،
چلی جا رہی ہے،
چلی جا رہی ہے

اس طرف جس کی کوئی خبر نہیں
اور بندرگاہ سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے

جو میری آرزوؤں کے ایوان کا شمعدان ہے
اور ایک دکھ کے انسان کو
سرگردان لیے جا رہی ہے
ایک طوفان کے بنے ہوئے گرداب کی طرف
(مجھ سے بنے ہوئے)
اور ایک دکھ کا مَیں
شرابوں کے ساتھ،
کندھے کے بوجھوں کے ساتھ،
ایک انسان کے عشقوں کے ساتھ،
غرق ہو جاتا ہے
اور نرگس غرق ہو جاتی ہے
اس کشتی کے ساتھ جو چل رہی ہے
انسان متواتر گا رہا ہے
(آہستہ آہستہ گا رہا ہے):
تو تھک کر رہ جائے رستے میں
میں پھر بھی تیرے پیچھے آؤں گا
جب تک جان میں جان ہے جانی
تیرا کھوج لگاؤں گا —
اور وہ اس کے ساتھ ڈوب جاتا ہے
شاید ہزاروں کے اندیشے میں،
اور یقیناً ہزاروں میں سے ایک کے اندیشے میں،
لاکھوں میں سے ایک کے اندیشے میں

میرے دکھ کا انسان غرق ہو چکا ہے
اور نرگس غرق ہو چکی ہے
اندیشوں میں ،
سمندروں میں ،
(آنکھوں کے سمندروں میں)
سمندر اور آنکھیں نیلی ہیں ،
نیلی ہیں ،
نیلی ہیں —
اور مَیں ایک ،
ہزاروں میں سے ایک ،
لاکھوں میں سے ایک —
غرق ہو چکا ہوں
اپنے دکھوں کے ساتھ ،
اپنی شرابوں کے ساتھ ،
اپنے سمندروں کے ساتھ ،
اور اپنے عشقوں کے ساتھ !

باغستان سبز

نفس در سینہ ام زنگی ست ، امشب بر بلند هول
بطبلش گرم میکوبد ۔
کسی در میزند ۔ باداست ، (میگویم بگوش هول خود) باداست ،
جدا از باد کس را بادرخت دور کاری نیست ،
کسی هر لحظہ بر در میزند ۔
و من با هر نفس (هرکوفتن برطبل) میجویم بجان سوی رهائی راه ۔
کسی آرامتر از پیش بر در میزند گوئی !
چو میآیم بگویم باز باخود "باد . . ."
شباهت مینشاند ضربۂ آرام بر در را، درون ریزش باران ۔
و راهی میکند آواز آنرا ، با نثارش نرم ،
ز کوره راه گوش من
بباغستان چشم من ۔
و من در باغ سبز چشم خود آرام میگیرم ،
و شب آرام میگیرد ،
و در آرام میگیرد . . .

سرسبز باغوں کی زمین

میرے سینے میں میرا سانس حبشی ہے
جو خوف کی اونچائی پر کھڑا

زور زور سے ڈھول بجا رہا ہے

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے — "ہوا ہے !"

میں اپنے خوف کے کانوں میں کہتا ہوں — "ہوا ہے،

ہوا کے سوا کون

دور افتادہ درختوں کی خبر لیتا ہے ؟"

کوئی متواتر دروازہ پیٹ رہا ہے

اور میں ہر سانس کے ساتھ

(ڈھول کی ہر تھاپ کے ساتھ)

دل و جان کے ساتھ، اپنے جسم سے نجات کا راستہ ڈھونڈتا ہوں

کوئی پہلے سے آہستہ دستک دے رہا ہے، گویا

جب میں آتا ہوں، پھر اپنے آپ سے کہتا ہوں

"ہوا..."

صداؤں کا ایک سا روپ

دروازے کی ملائم دستک کو بارش کی رِم جھم میں بدل دیتا ہے

اور اس کی آواز کو میرے کانوں کے اندھے راستوں کی طرف

دھکیل دیتا ہے،

میری آنکھوں کے باغوں کی سرزمین کی طرف،

اور میں اپنی آنکھوں کے سرسبز باغوں میں سو جاتا ہوں

اور رات سو جاتی ہے

اور دروازہ سو جاتا ہے۔

———

محمد زُہری

پیدائش شہسوار میں ۱۹۲۶ء میں ہوئی - اب تہران میں کتاب خانۂ ملّی (نیشنل لائبریری) کے لائبریرین ہیں - ۱۹۵۳ء میں تہران یونیورسٹی سے ادبیات میں بی - اے پاس کیا اور اس کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی - ۱۹۵۶ء سے اب تک سرکاری ملازم ہیں - چند سال مختلف مدارس میں فارسی زبان اور ادب کے معلّم رہ چکے ہیں - کچھ عرصہ اقتصادی منصوبہ بندی کے محکمے کے سرکاری رسالے ''ایران آباد'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ، اور بعد میں وزارتِ تعلیم کے رسالے ''فرہنگ'' کے مدیرِ معاون مقرر ہوئے - نظموں کے مجموعوں میں ''جزیرہ'' ، ''گلایہ'' ، ''شبنامہ'' اور ''... و تتمہ'' شائع ہو چکے ہیں - منتخب نظموں کا ایک مجموعہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا - نیشنل لائبریری کی سالانہ فہرستیں مرتب کرنے کا فریضہ بھی اُن کے ذمّے ہے - زیرِ نظر مجموعے کے لیے نظمیں ''گلایہ'' اور ''... و تتمہ'' سے انتخاب کی گئی ہیں -

زائرانِ شهید

چاوشان ، هشدار می دادند :

— "های ! ، راه کاروان کور است

تنگه دردست که انداران کافر کیش مغرور است ـ "

کاروان درماند

اسپهای رام ، رم کردند

آرزوی تپهٔ گنبد نما بگسیخت

از همه شوق زیارت ، با دل و جان ، وحشتی آویخت

حسرت بوسیدن آن آستان پاک ، در دل ریخت

زائران در انتظار کافران ماندند

ورد زنهار و امان خواندند

چاوشان ، امید می دادند :

— "های ! . . . باکی نیست

آفتاب معجزش در واپسین دم ، باز خواهد تافت

هر که معصوم است ، آخر در ضریحش ، بار خواهد یافت ـ"

جویبار خون به راه افتاد

نبضها باز ایستاد

این چه آیین بود ؟

یا نبود اندر گروہ زائران ، معصوم
یا خداوندا ! زبانم لال ۔
آن حدیث معجزش حرفِ دروغین بود ۔

زائروں کی شہادت

نقیب پکار رہے تھے :
"اے قافلے والو ، ہوشیار ! راستہ اندھا ہے
اور درّے پر کافر اور ظالم گولی ماروں کا قبضہ ہے

کارواں کے پاؤں رک گئے
اُن کے سدھے ہوئے گھوڑے بھاگ کھڑے ہوئے
گنبد نما چٹان تک پہنچنے کی آرزو ہوا ہو گئی
زیارت کا وہ تمام شوق ، دل و جان نثار کرنے کی وہ تمام خواہش
وحشت کی نذر ہو گئی
اُس آستانِ پاک کو بوسہ دینے کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی!
زائر کافروں کے انتظار میں سہم کر بیٹھ گئے
اور الامان ، الحفیظ کا ورد کرنے لگے ۔

نقیب دلاسا دینے لگے :
"ڈرو نہیں ، اے قافلے والو ! ڈرو نہیں
اُس کی کرامات بڑی ہے
اُس کی کرامات کا سورج نکل کر رہے گا
آخری وقت نکل کر رہے گا

جو تم میں سے پاک ہے ، وہ اس کی بارگاہ تک پہنچ کر رہے گا"

چیخ پکار شروع ہو گئی ، خون کی ندیاں بہنے لگیں ،
نبضیں تھم کر رہ گئیں

یہ کیا قانون تھا ؟
یا ان زائروں کے پورے گروہ میں کوئی پاک مرد نہ تھا
یا ، خاکم بدہن ، اے خداوند !
اس کی کرامات کا ذکر محض جھوٹ تھا ؟

تلاش

باد ،

باذی سرد ،

باد شب

-

ریشہ در گل ، شاخہ دو راز خاک

شاخہ از ریشہ جدا ماندہ ، شکوفہ بار

ساقہ اما پوک

ریشہ در گل ، در تلاش شیرہ ھای خاک

شاخہ با گل ، پایہ ماہ میوہ ھای پاک

ساقہ اما پوک و خشک آوند

ماجدا از ہم ، برای ہم ، تلاشی بی ثمر داریم ۔

تلاش

ہوا !

ٹھنڈی ہوا ،

رات کی ہوا ،

جس کی جڑیں خاک میں ، اور شاخیں زمین سے دور

شاخیں جڑوں سے الگ تھلگ کلیاں برساتی ہوئی ،

لیکن تنا اندر سے کھوکھلا !

مٹّی میں دبی ہوئی جڑیں خاک سے رس لینے کی کوشش میں
شاخیں پھولوں سے لدی ہوئی اور صاف ستھرے پھل
چاند سے دو ہاتھ آگے
لیکن تنا پھر بھی کھوکھلا اور جیسے سوکھا ہوا !

ہم ایک دوسرے سے جدا ایک دوسرے کی تلاش میں ---
ایسی تلاش جس کا کوئی ثمر نہ ہو ۔

ہوشنگ ابتہاج

(سایہ)

رشت میں ۱۹۲۸ع میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ تہران کی شرکت سیان (سیمنٹ کمپنی) میں ملازم ہیں۔ انگلستان، فرانس، آسٹریا، روس اور ہندوستان کا سفر کر چکے ہیں۔ ماسکو یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی میں فارسی ادب پر لکچر دیے ہیں۔ نظموں کے مجموعے "سراب"، "شبگیر"، "سیاہ مشق"، "زمین" اور "چند برگ از شب یلدا" شائع ہو کر قریب قریب ناپید ہو چکے ہیں۔ موجودہ انتخاب کے لیے نظمیں "زمین" اور "چند برگ از شبِ یلدا" سے اخذ کی گئی ہیں۔

تشویش

بنشینیم و بیندیشیم
اینهمه باهم بیگانه
اینهمه دوری و بیزاری
بکجا آیا خواهیم رسید آخر ؟
و چه خواهد آمد برسر ما با این دلهای پراکنده ؟

جنگلی بودیم
شاخه در شاخه همه آغوش
ریشه در ریشه همه پیوند
وینک انبوه درختانی تنهائیم !

مهربانی بدل بستهٔ ما مرغی است
کز قفس در نگشادیمش
و بعذری که فضائی نیست ،
و ندربن باغ خزان خورده
جز سموم ستم آورده هوائی نیست ،
ره پرواز ندادیمش !

هستی ما ، که چو آئینه
تنگ بر سینهٔ نشردیمش از وحشت سنگ انداز ،
نه صفا و نه تماشا ، به چه کارآمد ؟

دشمنی دلها را بی کین خوگر کرد
دستها با دشنه همدستان گشتند
و زمین از بدخواهی بستوه آمد
ای دریغا که دگر دشمن رفت از یاد !
وینک از سینهٔ دوست
خون فرو میریزد !

دوست کاندر بر وی گریهٔ انباشته را نتوانی سرداد
چه توان گفتش ؟
بیگانه است ـ
و سرائی که به چشم انداز پنجره اش نیست درختی که بر او مرغی
به فغان تو دهد پاسخ ،
زندانست ـ

من ، بعهدی که بدی مقبول
و توانائی دانائی است ،
با تو از خوبی میگویم
از تو دانائی میجویم
خوب من ! دانائی را بنشان برتخت
و توانائی را حلقه بگوشش کن !

من بعهدی که وفا داری
داستانی است ملال آور ،
وابلهی نیست دگر ، افسوس !

داشتن جنگ برادرها را باور،
آشتی را،
به امیدی که خرد فرمان خواهد راند
میکنم تلقین ـ
وندرین فتنهٔ بی تدبیر
با چه دلشوره و بیمی نگرانم من!

اینهمه باهم بیگانه
اینهمه دوری و بیزاری
بکجا آیا خواهیم رسید آخر؟
و چه خواهد آمد بر سر ما با این دلهای پراگنده؟
بنشینیم و بیندیشیم.

تشویش

بیٹھ جائیں اور سوچیں،
آپس میں اتنی بیگانگی،
اتنی دوری، اتنی بیزاری!
آیا کہاں پہنچ کے دم لیں گے ہم؟
اور ہم پر کیا بیتے گی ان اجڑے دلوں کے ساتھ؟

جنگل تھے ہم
جس کی ٹہنیاں آپس میں ہم آغوش تھیں
جس کی جڑیں آپس میں پیوند
اور اب ہم کیا ہیں؟ محض درختوں کا ہجوم، تنہا تنہا!

اُلفت ہمارے بند دلوں کے اندر ایک پرندہ ہے
اُس کے پنجرے کا دروازہ تک نہیں کھولا ہم نے
اس بہانے سے کہ فضا تنگ ہے
اور اس خزاں زدہ باغ میں
کچھ نہیں ظلم کی لُو کے سوا
اسے اڑنے تک کی مہلت نہیں دی ہم نے۔

ہم نے اپنی ہستی کو جو آئینے کے مانند تھی
کسی پتھر پھینکنے والے کے ڈر سے
اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا
اس میں نہ چمک رہی ، نہ چہرہ
کس کام آیا یہ آئینہ ؟

دشمنی نے دلوں کو کینے کا عادی بنا دیا
ہاتھ خنجر کے حریف بن کر رہ گئے
اور زمین بدنیتی سے اکتا گئی
اب دشمن کی یاد تک باقی نہیں
افسوس کہ اب محبوب ہی کے سینے سے
خون ٹپکنے لگا ہے۔

وہ دوست جس کے سامنے کوئی اپنے رکے ہوئے آنسو نہ بہا سکے
ایسے دوست کو کوئی کیا کہے؟
وہ دوست نہیں ، پرایا ہے۔

اور وہ گھر جس کی کھڑکی کے سامنے دور تک کوئی ایسا درخت
نہ ہو
جس پر کوئی پرندہ کسی کی نغماں کا جواب تک دے سکے
گھر نہیں ، زنداں ہے -

مَیں ، ایک ایسے زمانے میں ، جب بدی کا بول بالا ہے
اور جب توانائی کا نام دانائی ہے
تجھ سے نیکی کی بات کر رہا ہوں
تجھ سے دانائی ڈھونڈھ رہا ہوں
اے میری نیک ساتھی ! آ اور دانائی کو پھر سے اپنے تخت
پر بٹھا
اور توانائی کو اس کا حلقہ بگوش کر دے -

مَیں ، ایک ایسے زمانے میں ، جب وفاداری
ایک دکھ بھری کہانی رہ گئی ہے
اور جب بھائیوں کی لڑائی پر یقین کرنا
بے وقوفی کی بات نہیں رہا — افسوس !
مَیں اس امید میں کہ عقل غالب آئے گی
ملاپ کی تلقین کر رہا ہوں -
اور اس فساد کے زمانے میں جس کا کوئی چارہ نہیں
مَیں کس بے چینی ، کس خوف کی حالت میں راہ تک رہا ہوں

آپس میں اتنی بیگانگی ،
اتنی دوری ، اتنی بیزاری !
آیا کہاں پہنچ کر دم لیں گے ہم ؟
اور ہم پر کیا بیتے گی ان اجڑے دلوں کے ساتھ
ہٹھ جائیں اور سوچیں —

شبگیر

دیگر این پنجره بگشای که من
بستوه آمدم از این شب تنگ !
دیرگاهیست که در خانهٔ همسایهٔ من خوالده خروس ـ
وین شب تلخ عبوس
می فشارد به دلم پای درنگ ـ

دیرگاهیست که من در دل این شام سیاه ،
پشت این پنجره بیدار و خموش
مانده ام چشم براه ،
همه چشم و همه گوش :
مست آن بانگ دلاویز که می آید نرم
محو آن اختر شبتاب که می سوزد گرم
مات این پردهٔ شبگیر که می بازد رنگ...

آری این پنجره بگشای که صبح
میدرخشد پس این پردهٔ تار ـ
میرسد از دل خونین سحر بانگ خروس ـ
وز رخ آینه ام می‌سترد رنگ فسوس
بوسهٔ مهر که در چشم من افشانده شرار
خندهٔ روز که با اشک من آمیخته رنگ

سویرا

یہ کھڑکی اب کھول بھی دو کہ میں
آکتا چکا ہوں اس تنگ رات سے -
میرے ہمسائے کے گھر بڑی دیر ہوئی
مرغ بول چکا ہے
لیکن میرے دل کے اندر ابھی رات ہے
غصیلی بدخو رات
پاؤں پسارے بیٹھی ہے -

بڑی دیر سے میں اس کالی رات کے اندر
اس کھڑکی کے پیچھے جاگتا ہوا چُپ چاپ
راستے پر آنکھ لگائے
ہمہ تن چشم ، ہمہ تن گوش

اُس دلکش آواز پر مست ، جو دُور سے ہلکے ہلکے آ رہی ہے
اُس رات کے تارے میں محو ، جو جھلملا رہا ہے
اُس اجالے کے پردے پر حیران ، جس کا رنگ اُڑا جا رہا ہے -

ہاں یہ کھڑکی کھول دو کہ ، صبح
اس تاریک پردے کے پیچھے جگمگا اٹھی ہے
صبح کے لہو میں ڈوبے ہوئے دل سے
مرغے کی اذان سنائی دے رہی ہے

اور سورج کے ایک بوسے نے،
جس سے میری آنکھوں میں شرارے چھوٹ رہے ہیں
اور دن کے ایک قہقہے نے،
جس کا رنگ میرے آنسوؤں سے ملتا ہے
میرے آئینے کے چہرے سے
غم کا رنگ دھو ڈالا ہے۔

گریه

سایه ها زیرِ درختان در غروب سبز میگریند ۔
شاخه ها چشم انتظار سرگذشت ابر ،
و آسمان چون من غبار آلود دلگیری است ۔

باد ، بوی خاک باران خورده می آرد ۔
سبزه ها در رهگذار شب پریشانند ۔
آه ! اکنون بر کدامین دشت میبارد ؟

باغ ، حسرتناک بارانی است ،
چون دلِ من در هوای گریۂ سیری ۔

رونا

سائے غروبِ آفتاب کے سبز رنگ میں
درختوں کے تلے رو رہے ہیں
شاخیں بادل کی کہانی سننے کے لیے
انتظار میں آنکھیں کھولے دیکھ رہی ہیں
اور آسمان میری طرح گرد سے اٹا ہوا اور غمگین ہے

ہوا بارش کی سینچی ہوئی مٹی کی خوشبو لاتی ہے
سبزے رات کے رہگذر میں آشفتہ حال ہیں
آہ ! یہ اب کون سے میدان پر برسے گی ؟
باغ بارش کو ترس گیا ہے
جیسے میرا دل جی بھر کر رونے کو ـــــ

مہدی اخوان ثالث

(م ۔ امید)

مشہدِ طوس میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے ۔ خاندان یزد کے دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتا ہے ۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم مشہد کے مدارس میں پائی ، اور اسی زمانے میں شعر و ادب کا ذوق پیدا ہوا ۔ ابتدائی کلام مشہد کے رسالہ ''آزادی'' میں شائع ہوتا رہا ۔ ۱۹۴۸ء میں تہران آ کر وزارتِ تعلیم میں ملازمت اختیار کی اور مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے ۔ ساتھ ساتھ لاء کالج میں داخلہ لے کر قانون کی تعلیم حاصل کی ۔ بعض سیاسی اور غیر سیاسی الزامات کی بنا پر دو دفعہ جیل جانا پڑا ، اس لیے قانون کی تعلیم مکمل نہ کر سکے ۔ قید سے رہائی پانے کے بعد شعر و ادب اور پرانی کتابوں کی تدوین کی طرف توجہ دی ۔ اس زمانے میں کلام مختلف رسالوں اور اخباروں میں برابر شائع ہوتا رہا ۔ ۱۹۵۱ء میں پہلا مجموعہ ''ارغنون'' شائع ہوا جس میں قدیم طرز کی غزلیں اور مقفلی نظمیں ہیں ۔ پھر جب نیما کے قریبی دوستوں کے حلقے میں شامل ہوئے تو جدید رنگ میں شعر کہنا شروع کیا ۔ نیز متعدد تنقیدی اور تحقیقی مقالات

بھی سپردِ قلم کیے - اب تک کئی اور مجموعے بھی چھپ چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں : "زمستان" ، "آخرِ شاہنامہ" "شکار" ، "ازین اوستا" ، "عاشقانہ ھا و کبود" اور "پائیز در زندان" - ایک اور شعری مجموعہ اور تنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ زیرِ اشاعت ہے - موجودہ مجموعے کے لیے نظمیں "آخرِ شاہنامہ" اور "ازین اوستا" سے ماخوذ ہیں -

آخر شاهنامه

این شکسته چنگ بی قانون ،
رام چنگی چنگی شوریده رنگ پیر ،
گاه گاهی خواب می بیند ـ
خویش را در بارگاه پر فروغ مهر
طرفه چشم انداز شاد و شاهد زرتشت ،

یا پریزادی چمان سرمست
در چمن زاران پاک و روشن مهتاب می بیند ـ
روشنیهای دروغینی
ـــ کاروان شعله های مرده در مرداب ـ
برجبین قدسی محراب می بیند ـ
یاد ایام شکوه و فخر و عصمت را ،
می سراید شاد ،
قصهٔ غمگین غربت را :

”هان ، کجاست
پایتخت این کج آئین قرن دیوانه ؟
با شبان روشنش چون روز ،
روزهای تنگ و تارش ، چون شب اندر قعر افسانه ـ

با قلاع سهمگین سخت و ستوارش ،
با لئیمانه تبسم کردن دروازه هایش ، سرد و بیگانه ـ

هان ، کجاست ؟
پایتخت این دژ آئین قرن پرآشوب ـ
قرن شکلک چهر ـ
برگذشته از مدار ماه ،
لیک بس دور از قرارِ مهر ـ
قرن خون آشام ،
قرن وحشتناک تر پیغام ،
کاندران با فضلهٔ موهوم مرغ دور پروازی
چار رکن هفت اقلیم خدا را در زمانی بر می آشوبند ـ
هر چه هستی ، هر چه پستی ، هر چه بالائی
سخت میکوبند ـ
پاک می روبند ـ

هان ، کجاست ؟
پایتخت این بی آزرم و بی آئین قرن ـ
کاندران بی گوله ئی مهلت
هر شکوفه ی تازه رو بازیچهٔ بادست ـ
همچنانکه حرمت پیران میوه ی خویش بخشیده
عرصهٔ انکار و وهن و غدر و بیدادست ـ

پایتخت اینچنین قرنی
کو ؟
بر کدامین بی نشان قله ست ،
در کدامین سو ؟
دیدبانان را بگو تا خواب نفریبد ـ
برچکاد پاسگاه خویش ، دل بیدار و سر هشیار ،
هیچشان جادوئی اختر ،
هیچشان افسون شهر نقرهٔ مهتاب نفریبد ـ

بر بکشتی های خشم بادبان از خون ،
ما ، برای فتح سوی پایتخت قرن میآییم ـ
تاکه هیچستان نه توی فراخ این غبار آلود بیغم را
با چکاچاک مهیب تیغهامان ، تیز
غرش زهره دران کوسهامان ، سهم
پرش خارا شکاف تیرهامان ، تند ،
نیک بگشاییم ،
شیشه های عمر دیوان را
از طلسم قلعهٔ پنهان ، ز چنگ پاسداران فسونگر شان ،
جلد بربائیم ـ
بر زمین کوبیم ـ
ور زمین ـ گهوارهٔ فرسودهٔ آفاق ـ
دست نرم سبزه هایش را به پیش آرد ،

تا که سنگ از ما نهان دارد ،
چهره اش را ژرف بشخاییم -

ما ،
فاتحان قلعه های فخر تاریخیم ،
شاهدان شهر های شوکت هر قرن -

ما ،
یادگار عصمت غمگین اعصاریم -

ما ،
راویان قصه های شاد و شیرینیم -
قصه های آسمان پاک -
نور جاری ، آب -
سرد تاری ، خاک -
قصه های خوشترین پیغام -
از زلال جویبار روشن ایام -
قصه های بیشهٔ انبوه ، پشتش کوه ، پایش نهر -
قصه های دست گرم دوست در شبهای سرد شهر -

ما ،
کاروان ساغر و چنگیم -
لولیان چنگمان افسانه گوی زندگیمان ، شعر و افسانه -
ساقیان مست مستانه -

هان ، کجاست ،

پایتخت قرن ؟

ما برای فتح می آییم ،

تا که هیچستانش بگشاییم . . .»

این شکسته چنگ دلتنگ محال اندیش ،

نغمه پرداز حریم خلوت پندار ،

جاودان پوشیده از اسرار ،

چه حکایتها که دارد روز و شب با خویش !

ای پریشانگوی مسکین ! پرده دیگر کن ـ

پور دستان جان ز چاه نا برادر در نخواهد برد ـ

مرد ، مرد ، او مرد ـ

داستان پور فرخزاد را سرکن ـ

آنکه گویی ناله اش از قعر چاهی ژرف میآید ـ

ناله و موید ،

موید و گوید :

«آه ، دیگر ما

فاتحان گوژ پشت و پیر را مانیم ـ

بربکشتی های موج بادبان از کف ،

دل بیاد بره های فرهی ، در دشت ایام تهی ، بسته ،

تیغهامان زنگخورد و کهنه و خسته ،

کوسهامان جاودان خاموش ،

تیرهامان بال بشکسته ـ

ما ،

فاتحان شهرهای رفته برباديم ـ

با صدای ناتوانتر زآنکه بیرون آید از سینه ،

راویان قصه های رفته از یادیم ـ

کس به چیزی ، یا پشیزی ، برنگیرد سکه ها مالرا ـ

گوئی از شاهی ست بیگانه ـ

یا ز میری دودمانش منقرض گشته ـ

گاهگه بیدار میخواهیم شد زین خواب جادوئی ،

همچو خواب همگنان غار ،

چشم میمالیم و میگوئیم : آنک ، طرفه قصر زرنگار صبح

شیرینکار ـ

لیک بی مرگ ست دقیانوس ـ

وای ، وای ، افسوس !"

شاهنامے کا آخر

یہ ٹوٹا ہوا چنگ ، جس کی آواز کسی سُرتال

کی پابند نہیں

ایک بوڑھے پریشان حال مطرب کے ہاتھوں میں بے بس

کبھی کبھی خواب بھی دیکھنے لگتا ہے ،

اپنے آپ کو سورج کی روشن بارگاہ میں ، جو زرتشت کو

محبوب تھی ،

جس پر زرتشت کی مسرّت بھری نظریں پڑتی تھیں
کسی ٹہلتی ہوئی مست پری زاد کے ساتھ
چاند کے روشن اور پاکیزہ چمن زاروں میں پاتا ہے
دلدلوں کے اندر بُجھے ہوئے شعلوں کے کاروانوں کو
وہ کسی محراب کی مقدّس جبین پر دیکھتا ہے
شوکت اور افتخار اور عصمت کے زمانے کی یاد میں
خوش خوش
اپنی غربت کی غمگین کہانی گاتا ہے:
"ہاں کہاں ہے
اس دیوانی، اُلٹے قانون والی صدی کا پایۂ تخت؟
جس کی راتیں دن کے مانند روشن
اور دن تنگ و تاریک
کسی افسانے کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی راتوں کے مانند،
جس کے قلعے سہمے ہوئے، دشوار اور مضبوط ہیں
جس کے دروازے کسی کنجوس کے مانند
ٹھنڈی پرائی ہنسی ہنستے ہیں۔

"ہاں کہاں ہے؟
اس ٹیڑھے قانون والی پُرآشوب صدی کا پایۂ تخت؟
یہ نقلی چہرے والی صدی
جو چاند کی گذرگاہ سے آگے نکل گئی
لیکن محبت کی منزل سے کوسوں دور ہے

خون پینے والی صدی

جس کے اندر دُور دُور اُڑنے والے پرندوں کے موہوم فضلے سے

(بے حد وحشت کا پیغام دینے والی صدی)

خدا کے ہفت اقلیم کے چاروں ستون ایک لمحے کے اندر

رولد دیے جاتے ہیں۔

جو کچھ ہے، پست ہو یا بالا

کوٹ پیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے

اُس کا پورا صفایا ہو جاتا ہے

ہاں کہاں ہے ؟

اِس بے قانون، بے شرم صدی کا پایۂ تخت ؟

جس میں ایک لمحے بھر کی مہلت کے بغیر

ہر تازہ و شاداب کلی ہوا کا کھلونا بن جاتی ہے

اُن بوڑھے درختوں کی آبرو کے مانند، جو اپنی کمائی نثار کر چکے ہوں۔

یہ صدی انکار، توہین، مکر اور ظلم کا میدان ہے

ایسی صدی کا پایۂ تخت

آخر کہاں ہے ؟

کس نامعلوم چوٹی پر ہے

کس جانب ؟

پہرے داروں سے کہو نیند کا دھوکا نہ کھائیں

اپنے پہرے کی اونچی چوکی پر جاگتے رہیں، ہوشیار رہیں۔

ستاروں کے کسی جادو

اور چاندنی کی چاندی کے بنے ہوئے کسی شہر کے افسون کو
لُبھانے نہ دیں ۔

خونیں بادبانوں والی ، غضب کی کشتیوں پر سوار
ہم اس صدی کے پایۂ تخت کو فتح کرنے آ رہے ہیں
تا کہ اس تہ در تہ ، کشادہ ، گرد سے اٹے ہوئے ، بے غم
شہر کو
اس ''ہیچستان'' کو
ہم اپنی تلواروں کی خوفناک چکا چاک سے جو تیز ہے
اپنے نقاروں کی زہرہ گداز چنگھاڑ سے جو دہلا دینے والی ہے
اپنے تیروں کی خارا شگاف پرواز سے جو تند ہے
چوپٹ جیت لیں
دیووں کی عمر کے شیشوں کو
پوشیدہ قلعوں کے طلسم سے ،
اُن کے جادو گر پہرے داروں کے پنجوں سے ،
چھڑا کر زمین پر پٹخ دیں اور توڑ ڈالیں ۔
اور زمین ، جو زمانوں کا پُرانا گہوارہ ہے
اگر اپنے سبزوں کی نرم نرم باہیں بڑھا کر
قیمتی پتھر کو ہم سے چھپانا چاہے
تو ہم اُس کے چہرے کو خوب نوچ ڈالیں ۔
ہم ،
تاریخی شرف کے قلعوں کے فاتح ہیں

ہر زمانے کی شوکت کے شہروں کے گواہ ہیں

م ،

زمانوں کی غم زدہ عصمت کی یادگار ہیں ۔

ہم ،

مسرت بھری میٹھی کہانیوں کے راوی ہیں

پاک آسمان کی کہانیوں کے

جن میں پانی بہتا ہوا نور ہے

اور مٹی سرد ، تاریک

ایسی کہانیاں جو نہایت خوب صورت سندیسا دیتی ہیں ۔

وہ کہانیاں ، زمانے کی جھلکتی ہوئی لذیوں کا شفاف پانی

جن کا سرچشمہ ہے

گھنے جنگلوں کے قصے ، جن کے پیچھے پہاڑ ہیں

جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں

شہر کی سرد راتوں میں محبوب کے گرم گرم ہاتھوں کے قصے ۔

ہم ،

شراب و نغمہ کے کارواں ہیں

ہمارے سازوں کی شوخ و شنگ عورتیں

مست مستانی عورتیں

ہماری زندگی کا افسانہ سنانے والی

وہ زندگی جو شعر و افسانہ ہے

ہاں کہاں ہے

صدی کا پایۂ تخت ؟

ہم فتح کرنے آئے ہیں

تاکہ اس ہیچستان کے دروازے چوپٹ کھول دیں ــــ"

یہ ٹوٹا ہوا اداس چنگ

جو انوکھی سے انوکھی بات سوچتا ہے

جو پندار کے نہاں خانوں کی خلوت کا نغمہ سناتا ہے

وہ نغمہ جس پر اسرار چھائے ہوئے ہیں

اپنے آپ سے کیسی کیسی کہانیاں کہتا ہے ۔

اے الٹی سیدھی باتیں کرنے والے بے چارے ،

کوئی نیا راگ الاپ ۔

زال کا بیٹا رستم اپنے سوتیلے بھائی کے کنوئیں سے بچ کر نہیں نکلے گا ۔

مر گیا ، مر گیا ، وہ مر گیا !

فرخزاد کے بیٹے رستم کی کہانی چھیڑ جو ہار گیا تھا

وہ جس کا نالہ گویا کسی کنوئیں کی تہ سے اٹھ رہا ہے

رو رہا ہے ، فریاد کر رہا ہے

فریاد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے :

"آہ ، اب ہم

کسی کبڑے بوڑھے فاتح کے مانند ہیں

ان کشتیوں پر سوار

جن کے بادباں لہروں کا جھاگ ہیں ۔

ہم نے اپنا دل
کسی سُنسان زمانے کے میدان میں چرتی ہوئی
گزری ہوئی شان و شوکت کی بھیڑوں سے لگا رکھا ہے۔
ہماری تلواروں کو زنگ لگ گیا ہے
تلواریں پرانی اور بے کار ہو چکی ہیں
ہمارے نقّارے ابد تک خاموش ہیں
ہمارے تیروں کے پَر ٹوٹ چکے ہیں
ہم،
اب اُجڑے شہروں کے فاتح ہیں
اور اپنی اس نحیف آواز کے ساتھ
جو ہمارے سینوں سے نکل رہی ہے
ہم بُھولے بسرے قصّوں کے راوی ہیں۔
اب کوئی شخص کسی چیز کے بدلے، ایک کوڑی کے بدلے بھی
ہمارا سکّہ قبول نہیں کرتا
گویا ہر شخص کسی بادشاہ سے بیگانہ ہو گیا ہے
یا اُس کا خاندان کسی سردار سے منحرف ہے۔
ہم کبھی اپنی سحر زدہ نیند سے آنکھیں کھولیں گے،
غار کے ساتھیوں کے مانند،
تو ہم آنکھیں ملیں گے اور کہیں گے:
''وہ دیکھو!
سہانی صبح نے کیسا عجیب سنہرا محل بنا رکھا ہے!
لیکن دقیانوس کو موت نہیں آ سکتی
ہائے! ہائے! افسوس!''

پیوندها و باغ

لحظه ای خاموش ماند ، آنگاه

بار دیگر سیب سرخی را که در کف داشت

بهوا انداخت ـ

سیب چندی گشت و باز آمد ـ

سیب را بویید ـ

گفت :

"گپ زدن از آبیاریها و از پیوندها کافی ست ـ

خوب ،

تو چه می گویی ؟"

ـــ "آه !

چه بگویم ؟ هیچ !"

سبز و رنگین جامه ای گلبفت برتن داشت ـ

دامن سیرابش از موج طراوت مثل دریا بود ـ

از شکوفه های گیلاس و هلوطوق خوش آهنگی بگردن داشت ـ

پرده ای طناز بود از مخملی ـ که خواب که بیدار
با حریری که بآرامی وزیدن داشت ـ
روح باغ شاد همسایه
مست و شیرین می خرامید و سخن می‌گفت ،
و حدیث مهربانش روی بامن داشت ـ
من نهادم سر به نرده ئی آهن باغش
که مرا از او جدا می کرد ،
و نگاهم مثل پروانه
در فضای باغ او می گشت ،
گشتن غمگین پری در باغ افسانه ـ
او به چشم من نگاهی‌کرد ـ
دید اشکم را ـ

گفت :

ــ "ها ! چه خوب آمد بیادم ، گریه هم کاری ست ـ
گاه آن پیوند با اشک ست ، یا لفرین
گاه با شوق ست ، یا لبخند ،
یا اسف یا کین ،
و آنچه زینسان ، لیک باید باشد این پیوند ـ"
بار دیگر سیب را بوبید و ما کت مالد ـ
من نگاهم را چو مرغی مرده سوی باغ خود بردم ـ

آه !

خامشی بهتر .

ورنه من باید چه می گفتم به او ، باید چه می گفتم ؟

گرچه خاموشی سرآغاز فراموشی ست ،

خامشی بهتر ،

گاه نیز آن بایدی پیوند کو می گفت ، خاموشی ست .

چه بگویم ؟ هیچ

جوی خشکیده ست و از بس تشنگی دیگر

بر لب‌جو بوته های بارهنگ و پونه و خطمی

خوابشان برده ست .

باتنی بی خویشتن ، گویی که در رؤیا

می برد شان آب ، شاید نیز

آبشان برده ست .

بعزای عاجلت ای بی تجابت باغ ،

بعد از آنکه رفته باشی جاودان برباد ،

هر چه هر جا ابر خشم از اشک نفرت باد آبستن

همچو ابر حسرت خاموشبار من .

ای درختان عقیم ریشه تان در خاکهای هرزگی مستور ،

یک جوانه ی ارجمند از هیچ جاتان رست نتواند .

ای گروهی برگ چرکین تار چرکین پود ،

یادگار خشک سالیهای گرد آلود ،

هیچ بارانی شما را شست نتواند .

باغ اور پیوند

وہ تھوڑی دیر چپ رہی ، پھر
اُس لال سیب کو جو اُس کے ہاتھ میں تھا
اُس نے دوبارہ ہوا میں اُچھالا ۔
سیب ہوا میں تھوڑی دور جا کر لوٹ آیا
اُس نے سیب کو سونگھا اور بولی
"آبیاری اور پودوں کو پیوند لگانے کی
بات کرنا ہی کافی ہے ۔
خوب ، تم کیا کہتے ہو ؟"
— "آہ !
کیا کہوں ؟ کچھ نہیں !"

اُس کے بدن پر سبز اور رنگین گُل بفت کا لباس تھا
اُس کا پانی میں شرابور دامن اپنی تازگی کی لہروں کے باعث
سمندر کے مانند تھا
اُس کے گلے میں چیری اور آڑو کے شگوفوں کا
خوبصورت ہار تھا ۔
وہ مخمل کا بنا ہوا شوخ رنگ پردہ تھی جو — کبھی نیند میں ،
کبھی جاگتے — ریشم کے مانند آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا ۔
ہمسایے کے باغ کی یہ خوش باش رُوح
مستی میں مزے مزے سے ٹہل رہی تھی ، باتیں کر رہی تھی
اور اُس کی محبت بھری باتوں کا مخاطب میں تھا ۔

میں نے اُس کے باغ کی آہنی دیوار پر سر رکھ دیا
جو میرے اُس کے درمیان حائل تھی ۔
اور میری نگاہیں پروانے کے مانند
اُس کے باغ کی فضا میں منڈلانے لگیں ۔
جیسے کوئی غمگین پری کسی افسانے کے باغ میں
ٹہل رہی ہو ۔
اُس نے میری طرف دیکھا
میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے
کہنے لگی :
"ہائے کیسے یاد آیا ، کہ رونا بھی
کاموں میں کام ہے !"
کبھی یہ پیوند آنسوؤں سے لگایا جاتا ہے ،
کبھی بد دعاؤں سے ،
کبھی آرزوؤں سے ، کبھی مسکراہٹوں سے ،
کبھی ہشیاریوں سے ، کبھی انتقام سے ،
جیسا بھی ہو پیوند تو ہے"
اُس نے دوبارہ سیب کو سونگھا اور چُپ ہوگئی
میں نے ایک سہمے ہوئے پرندے کی طرح اپنے باغ پر نظر ڈالی ۔

آہ !
چُپ ہی اچھی
ورنہ میں آخر کہتا بھی کیا ؟ میں کہہ ہی کیا سکتا تھا ؟

اگرچہ خاموشی ابتدا ہے فراموشی کی ،

خاموشی ہی اچھی !

گا ہے یہی وہ ضروری پیوند ہے جسے اُس نے خاموشی کا نام دیا تھا

کیا کہوں ؟ کچھ نہیں

ندی کا پانی سوکھ گیا ہے اور پیاس کے مارے

ندی کے کنارے رنگترے اور گل خیرو کے پودے سو گئے ہیں

گویا بے ہوشی میں یا عالمِ خواب میں

پانی اُن کو بہائے لیے جا رہا ہے

پانی اُنھیں بہا لے گیا ہے ۔

اے کم ذات باغ ! جلد ہی

جب تو ہمیشہ کے لیے اجڑ جائے گا ،

تیرے سوگ میں ،

جہاں کہیں اور جیسے بھی غصّے کا بادل

نفرت کے آنسوؤں سے بھر جائے گا

میری اِس کم سُم حیرت کے بادل کے مانند ۔

اے بنجھر درختو ! جن کی جڑیں

لغویت کی تہوں میں مستور ہیں

کوئی بیش بہا کونپل تمھارے کہیں سے پھوٹ نہیں سکتی
تم محض پتّوں کا جُھرمٹ ہو ، گندے گلے سڑے پتّوں کا
خاک سے اٹے ہوئے ، قحط کے زمانوں کی یادگار :
کوئی بارش تمھیں دھو کر پاک نہیں کر سکتی ۔

نماز

باغ بود و دره — چشم انداز پر مهتاب ـ
ذاتها با سایه های خود هم اندازه ـ
خیره در آفاق و اسرار عزیز شب ،
چشم من — بیدار و چشم عالمی در خواب ـ

نه صدائی جز صدای رازهای شب ،
و آب و لرزای نسیم و جیر جیرکها ،
پاسداران حریم خفتگان باغ ،
و صدای حیرت بیدار من (من مست بودم ، مست)

خاستم از جا
سوی جو رفتم ، چه می آمد
آب ـ
یا نه ، چه می رفت ، هم ز انسانکه حافظ گفت ، عمر تو ـ
با گروهی شرم و بیخویشی وضو کردم ـ
مست بودم ، مست سر نشناس ، پا نشناس ، اما لحظهٔ پاک و عزیزی بود ـ

برگکی کندم
از نہال گردوی نزدیک ،
و نگاھم رفتہ تا بس دور ۔
شبنم آجین سبز فرش باغ ھم گستردہ سجادہ ۔
قبلہ ، گو ھرسو کہ خواھی باش ۔
با تو دارد گفت و گو شوریدۂ مستی ۔
— مستم و دانم کہ ھستم من ۔
ای ھمہ ھستی ز تو ، آیا تو ھم ھستی ؟

نماز

باغ تھا اور وادی — منظر چاندنی سے لبریز
اشیا اپنے اپنے سایوں کے برابر
میری آنکھ آفاق پر ، اور رات کے بیش بہا اسرار پر لگی ہوئی
میری آنکھ جاگتی ہوئی اور ایک دنیا کی آنکھ نیند سے سرشار ۔

کوئی صدا نہیں آتی ، رات کے بھیدوں کی سائیں سائیں کے سوا
بانی کی نسیم کی سرسراہٹ اور جھینگروں کی چیخوں کے سوا
— جو باغ میں سوئے ہوؤں کے پاسبان ہیں —
اور میری حیرتِ بیدار کی آواز کے سوا ۔
"میں مست تھا ، مستی میں چُور !

میں اپنی جگہ سے اُٹھا
ندی کی طرف چل دیا — کیا چیز آ رہی تھی ؟
پانی ؟
یا نہیں — کیا چیز جا رہی تھی ؟
یا بقولِ حافظ — کسی کی عمر !
شرم اور بے خودی کے ہجوم میں میں نے وضو کیا
میں مست تھا ، ایسا مست جسے سر کا ہوش نہ پیر کا
لیکن سماں کتنا پاکیزہ تھا ، کتنا پیارا !

میں نے ایک پتّی توڑی
ایک پاس ہی کے اخروٹ سے
اور میری نظر کہیں دور جا اٹکی ۔
باغ کے شبنم آلود فرش نے بھی مصلّے بچھا رکھا تھا
قبلہ ؟ جدھر چاہو قبلہ تھا ۔
ایک شوریدہ سرمست تجھ سے ، کچھ کہنا چاہتا ہے :
— میں مست سہی لیکن جانتا ہوں کہ میں ہوں —
یہ تمام ہستی تجھ سے ہے
لیکن تو بھی ہے کہیں ؟

______

سهراب سپہری

خاندان ، کاشان کا رہنے والا ہے لیکن ان کی ولادت قم میں ہوئی (۱۹۲۸ع) جہاں آن دنوں ان کے والد ڈاک اور تار کے محکمے میں ملازم تھے ۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کاشان میں پائی ۔ ۱۹۴۵ع میں تہران کے دانش سرائے مقدماتی (جونیر ٹیچرز ٹریننگ کالج) سے ڈپلوما لے کر محکمۂ تعلیم کاشان میں ملازم ہوگئے ۔ تین سال بعد یہ ملازمت ترک کر کے ادبیات میں ڈپلوما حاصل کیا اور پھر دانش کدۂ ہنرہائے زیبا (فائن آرٹس کالج) تہران میں داخلہ لیا ، اور ساتھ ساتھ سابق اینگلو ایرانین آئل کمپنی میں بھی کام کرتے رہے ۔ اسی زمانے میں پہلا مجموعہ "درکنارِ چمن" شائع ہوا ۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ع میں دوسرا مجموعہ "مرگ رنگ" ، ۱۹۵۴ع میں تیسرا مجموعہ "زندگی خوابہا" ، ۱۹۶۱ع میں چوتھا مجموعہ "آوازِ آفتاب" اور ۱۹۶۸ع میں پانچواں اور اب تک آخری مجموعہ "حجمِ سبز" چھپا ۔ وہ شاعر کے علاوہ نقّاش بھی ہیں ، اور دنیا کے بہت سے ملکوں کا سفر کر چکے ہیں ، جن میں جاپان ، ہندوستان اور پاکستان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ یورپ کے کئی ملکوں کے نگارخانوں

میں اُن کی تصویریں آویزاں ہیں۔ کئی ملکوں میں مصوّری کی نمائشوں میں حصہ لیا ہے اور انعام پا چکے ہیں۔ ایران میں مصوّری کے معلّم بھی رہ چکے ہیں۔ اب ایک عرصے سے تہران میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ موجودہ مجموعے کی نظمیں "حجمِ سبز" اور رسالہ "روزن" سے لی گئی ہیں۔

جنبش واژهٔ زیست

پشت کاجستان ، برف ـ
برف ، یک دسته کلاغ ـ
جاده یعنی غربت ـ
باد ، آواز ، مسافر ، و کمی میل به خواب ـ
شاخ پیچک ، و رسیدن ، و حیاط ـ

من ، و دلتنگ ، و این شیشهٔ خیس ـ
می نویسم ، و فضا ـ
می نویسم ، و دو دیوار ، و چندین گنجشک ـ

یک نفر دلتنگ است ـ
یک نفر می بافد ـ
یک نفر می شمرد ـ
یک نفر می خواند ـ

زندگی یعنی : یک سار پرید ـ
از چه دلتنگ شدی ؟
دلخوشی ها کم نیست : مثلاً این خورشید ،
کودک پس فردا ،
کفتر آن هفته ـ

یک نفر دیشب مرد

و ہنوز ، نان گندم خوب است ۔

و ہنوز ، آب می ریزد پایین ، اسب ها می نوشند ۔

قطرہ ھا در جریان ،

برف بر دوش سکوت

و زمان روی ستون فقرات گل یاس ۔

زندگی کا متحرّک بول

کاج کے جنگل کے اوپر برف

برف ، کوّوں کی ایک ڈار

راستے کے معنی ، پردیس

ہوا ، آواز ، مسافر اور کسی قدر اونگھ

عشق پیچاں کی بیل اور منزل پر پہنچ جانا اور گھر کا صحن

میں اور اداس اور کھڑکی کے بھیگے ہوئے شیشے ،

لکھ رہا ہوں ، اور فضا

لکھتا جا رہا ہوں اور دو دیواریں اور کچھ چڑیاں

کوئی اداس ہے

کوئی بُن رہا ہے

کوئی گِن رہا ہے

کوئی گا رہا ہے
زندگی کے معنی ایک تلیر اڑ گیا
تو کس وجہ سے اداس ہو گئی ؟
خوشی کے بہانے کم نہیں ، مثلاً یہ سورج
پرسوں آنے والا بچہ
اس ہفتے والا کبوتر
کوئی شخص رات مر گیا
اور گیہوں کی روٹی ابھی باسی نہیں ہوئی
اور ابھی تک بانی گر رہا ہے ، گھوڑے پی رہے ہیں

قطرے ٹپک رہے ہیں
سکوت کے کندھوں پر برف
اور وقت
یاسمن کی کمر کی ہڈی کے اوپر جا گزیں ۔

همیشه

عصر
چند عدد سار
دور شدند از مدار حافظهٔ کاج -
نیکی جسمانی درخت بجا ماند -
عفت اشراق روی شانهٔ من ریخت -

حرف بزن ، ای زن شبانهٔ موعود !
زیر همین شاخه های عاطفی باد
کودکی ام را به دست من بسپار -
در وسط این همیشه های سیاه
حرف بزن ، خواهر تکامل خوشرنگ !
خون مرا پرکن از ملایمت هوش -
نبض مرا روی زیری نفس عشق
فاش کن -
روی زمین های محض
راه برو تا صفای باغ اساطیر -
در لبهٔ فرصت تلالؤ انگور
حرف بزن ، حوری تکلم بدوی !

حزن مرا در مصب دور عبارت
صاف کن ۔
در همۂ ماسه های شور کسالت
خنجرۂ آب را رواج بده ۔

بعد
دیشب شیرین پلک را
روی چمن های بی تموج ادراک
پهن کن ۔

ہمیشہ

تیسرے پہر
چند عدد تلیر
کاج کے حافظے کے مدار پر سے اڑ گئے
درخت کے جسم کی نیکی قائم رہی
الہام کی پاکیزگی میرے شانوں پر برس پڑی

بات کر ، اے وعدے کی رات آنے والی !
ہوا کی انھی جوشیلی شاخوں کے لیے
میرا بچپن مجھے سونپ دے
ان سیاہ ہمیشاؤں کے درمیان

بات کر ، اے خوبصورت تکمیل کی ہم زاد
ہونٹوں کی نرمی سے میرا لہو بھر دے
میری نبض کو عشق کی ناہموار سانسوں کے اوپر
آشکار کر ۔

خالص زمینوں کے اوپر چلتی ہوئی
پرانی کہانیوں کے باغوں کے اُجالے کی طرف بڑھ !
انگوروں کی درخشانی کی مہلت کے کنارے
بات کر ، اے گفتارِ ازل کی حور !
میرے غم کو
بیان کی ندی کے دُور دراز دہانے میں دھو ڈال
سُستی کی تمام نمکین اور باریک ریتوں کے اندر
پانی کے حلق کو رواج دے ۔

پھر
اپنی پلکوں کی گذری ہوئی میٹھی رات کو
ادراک کے بے حس و حرکت باغیچوں کے اوپر
پھیلا دے ۔

شب[1]

ای میان سخن های سبز نجومی !
برگ انجیر ظلمت
عفت سنگ را می رساند ۔
سینهٔ آب در حسرت عکس یک باغ
می سوزد ۔
سیب روزانه
در دهان طعم یک و هم دارد ۔
ای هراس قدیم !
در خطاب تو انگشت های من از هوش رفتند ۔
امشب
دست هایم نهایت ندارند :
امشب از شاخه های اساطیری
میوه می چینند ۔
امشب
هر درختی به اندازهٔ ترس من برگ دارد ۔

---

۱ ۔ راشد صاحب نے اس نظم کا نام "شب" (رات) لکھا ہے مگر سہراب سپہری کی کتاب "ہشت کتاب" میں اس کا نام "متن قدیم شب" ہے ۔
(آفتاب اصغر)

جرأت حرف در حرم دیدار حل شد ـ
ای سرآغاز های ملون !
چشم های مرا در وزش های جادو حمایت کنید ـ
من هنوز
موهبت های مجهول شب را
خواب می بینم ـ
من هنوز
تشنهٔ آب های مشبک
هستم ـ
دکمه های لباسم
رنگ اوراد اعصار جادوست ـ
در علف زار پیش از شیوع تکلم
آخرین جشن جسمانی ما بپا بود ـ
من در این جشن موسیقی اختران را
از درون سفالینه ها می شنیدم
و نگاهم پر از کوچ جادوگران بود ـ
ای قدیمی ترین عکس نرگس در آیینهٔ حزن !
جذبهٔ تو مرا همچنان برد ـ
ـــ تا هوای تکامل ؟
ـــ شاید ـ

در تب حرف ، آب بصیرت بنوشیم -

زیر ارث پراکندهٔ شب

شرم پاک روایت روان است :
در زمان های پیش از طلوع هجاها
محشری از همه زندگان بود -
از میان تمام حریفان
فک من از غرور تکلم ترک خورد -
بعد
من که تا زانو
در خلوص سکوت نباتی فرو رفته بودم
دست و رو در تماشای اشکال شستم -
بعد ، در فصل دیگر ،
کفش های من از "لفظ" شبنم
تر شد -
بعد ، وقتی که بالای سنگی نشستم
هجرت سنگ را از جوار کف های خود می شنیدم -
بعد دیدم که از موسم دست هایم
ذات هر شاخه پرهیز می کرد -
ای شب ارتجالی !
دستمال من از خوشهٔ خام تدبیر پر بود -
پشت دیوار یک خواب سنگین

یک پرندہ کہ از انس ظلمت می آمد
دستاں مرا برد ۔
اولین ریگ الہام در زیر پایم صدا کرد ۔
خون من میزبان رقیق فضا شد ۔
نبض من درمیان عناصر شنا کرد ۔

ای شب ...
لہ ، چہ می گویم ،
آب شد جسم سرد مخاطب در اشراق گرم دریچہ ۔
سمت انگشت من با صفا شد ۔

رات

ان نجومیوں کی سی سبز باتوں کے درمیان کرسی قریب لا ۔
تُو ، جس کا منہ مناظر سے لبریز !
میرے احساس کے کان چاند گرہن لگنے سے پہلے پہلے
ایک باغ لگانے کے مشتاق ہیں ۔
تاریکی کی انجیروں کے پتّے
پتھّر کی پاکیزگی کو بکھیر رہے ہیں ۔
اور پانی کے کُھلے بازوؤں سے گنتی کا بوجھ گر رہا ہے ۔
میں کس توہّم کی جانب رُخ کر کے اٹھ گیا تھا ، کہ میری
پیشانی تر ہو گئی ؟

آہ ! اے ابتدا کے خوف کی شراب !

جب تُو نے مجھے پکارا تو میری انگلیاں مدہوش ہو گئیں ۔

آج رات میرے ہاتھ یہاں سے لے کر تاریخ سے بھی پہلے کے

باغوں کے کناروں تک پھیلے ہوئے ہیں ۔

آج رات میرے ہاتھوں کی کوئی انتہا نہیں ۔

ان درختوں کے پتّے میرے خوفوں کے برابر ہیں ۔

اے آبا ، اے دور تک پھیلے ہوئے آبا !

جو فضا کی وسعتوں کے متن کے اندر آج بھی موجود ہو

میرے مسطر نے رات کی قطعیت کی وسعتوں میں

اپنی موروثی صحّت کی پاکیزگی کھو دی ۔

روزانہ تدبیروں کا جسم ادراک کی مایوسی میں گھُل مل گیا ۔

ہوش کی ٹھنڈک پسینہ بن کر جسم کے مساموں سے ٹپک رہی ہے ۔

اے رنگارنگ آغازوں کی ابتدا !

میرے ہاتھوں کو جادو کے ذوق کے سامنے گرما دے

مَیں ابھی

اپنے کالوں کی لوؤں کو عناصر کی پرانی صداؤں کی خاطر جلا

دے رہا ہوں

مَیں ابھی

ان پانیوں کا پیاسا ہوں جن کے اوپر دھوپ چھاؤں جال سے

بن دیتی ہے

اور ابھی سونے کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہی اپنے خنجر کو

پکارنے لگتا ہوں

میری قبا کے بٹن اسی جنس سے ہیں جس سے
جادو کے زمانوں کے فیروزی رنگ منتر بنے ہوتے تھے۔
ابھی ذہنوں کے اندر گلاب کے پھول نہیں کھلے تھے
کہ ہمارا جسموں کا آخری جشن برپا تھا۔
میں نے اس جشن میں مٹی کے برتنوں کے اندر انگلیاں بجنے
کی آواز سنی۔
اور میری نگاہیں شمشاد کے پودوں کی رخصت کے لمحوں سے
بھر گئیں
اے غم کی سطح کے اندر منعکس ہونے والے سب سے پرانے
باغ!
تیرا شوق مجھے یوں بہا لے گیا
کہ میں اس پُر رونق کارگاہ تک آ نکلا۔
وہ کون سا ہاتھ ہے جو میری پیشانی پر لکھ رہا ہے — ایک
خوشگوار انحراف؟
شاید
(آ، اے پڑھنے والے! ان مبہم دھڑکنوں میں ہم
اجلے پانی کا ایک پیالہ پئیں)
آنکھیں کہکشاں کی نرم ریت پر کس پیمانے کے نشانِ پا کو
پکارتی ہیں؟
پیالے پیمانے کے خوشگوار عجز سے لبریز ہو گئے ہیں۔
انسان کی ریتوں پر آج رات حروفِ تہجی کا ماتم ہے۔
گفتار کی شرم سے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں

(جی ہاں
تاریخ کے پچھواڑے ایک چراگاہ میں مجمع لگ رہا تھا
اور وحشیوں کے اس خوب صورت جمگھٹ میں
سب حاضرین میں سے صرف میرے ہی جبڑے تکلم کے غرور
سے کھل پڑے
پھر
میں ، جو سبزوں کی خاموشی کی پاکیزگی میں
زانوؤں تک گڑ گیا تھا
میں نے شکلوں کی موزوں صداؤں کے اندر ہاتھ منہ دھوئے۔
پھر کسی اور موسم میں
میرے جوتے شبنم کے "لفظ" سے تر ہو گئے
پھر جب میں ایک پتھر پر آ بیٹھا
تو میں نے اپنے پاؤں کے تلووں کی سرشت سے سنا
کہ پتھر غائب ہے
پھر میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں کے موسم سے ہر شاخ
کی ذات کنارہ کر رہی ہے)

اے یکایک آنے والی رات!
میرا رومال تکرار کے بکھرے ہوئے خوشوں سے پُر تھا
باغ کی دھوپ دیوار کے پیچھے
ہجر کی ایک ابابیل جو تاریکی کے پیار تک اُڑتی چلی گئی
میرا رومال اُڑا کر لے گئی

الہام کی اولین ریت میرے جوتوں کے نیچے بول اٹھی ۔
میرا لہو فضا کا رحم دل میزبان بن گیا ۔
میری نبض عناصر کے درمیان تیر رہی تھی ۔
کہُنی پر سر رکھ کر نیند میرے دماغ کی بہاروں کے اندر کھل اٹھی

اے وہ رات —

نہیں ، میں کیا کہہ رہا ہوں ؟
مخاطب کا پاک جسم دریچے کے متن کے ادراک کے اندر
پانی ہو کر بہہ گیا
اور جس طرف میری انگلیاں اٹھی تھیں اجالا ہو گیا ۔

آب

آب را گل نکنیم :
در فرودست انگار ، کفتری می خورد آب ۔

یا که در بیشهٔ دور ، سیره ای پر می شوید ۔
یا در آبادی ، کوزه ای پر می گردد ۔

آب را گل نکنیم :
شاید این آبِ روان ، می رود پای سپیداری ، تا فرو شوید اندوه دلی ۔

دست درویشی شاید ، نان خشکیده فروبرده در آب ۔

زن زیبایی آمد لب رود ،
آب را گل نکنیم :
روی زیبا دو برابر شده است ۔

چه گوارا این آب !
چه زلال این رود !
مردم بالادست ، چه صفایی دارند !
چشمه هاشان جوشان ، گاوهاشان شیر افشان باد !

من ندیدم دهشان ،
بی گمان ہای چپر ھاشان جا ہای خداست ۔
ماهتاب آنجا ، می کند روشن پہنای کلام ۔
بی گمان در ده بالا دست ، چینہ ھا کوتاہ است ۔
مردمش می دانند ، کہ شقایق چہ گلی است ۔
بی گمان آنجا آبی ، آبی است ۔
غنچہ ای می شکفد ، اهل ده با خبرند ۔
چہ دھی باید باشد !
کوچہ باغش پر موسیقی باد !
مردمان سر رود ، آب را می فہمند ۔
گل نکردندش ، ما نیز
آب را گل نکنیم ۔

پانی

پانی کو گدلا نہ کریں
بہاؤ کی طرف شاید کوئی کبوتر پی رہا ہو پانی
یا کسی دور جنگل میں کوئی بلبل کا چوزہ پر دھو رہا ہو
یا آبادی میں کوئی کوزہ بھرا جا رہا ہو

پانی کو گدلا نہ کریں
شاید یہ بہتا پانی ، جا رہا ہو کسی سفیدے کی طرف تا کہ کسی کا غم دھو ڈالے

کسی درویش کا ہاتھ شاید سوکھی روٹی بھگو رہا ہو پانی میں

ایک خوبصورت عورت آئی ہے ندی کے کنارے
پانی کو گدلا نہ کریں
اُس کا خوبصورت چہرہ دو چند ہوگیا ہے

کتنا خوشگوار ہے یہ پانی
کتنی پاکیزہ ہے یہ ندی
اُدھر والے لوگ کتنے صاف ستھرے ہیں
اُن کے چشمے اُبلتے رہیں! اُن کی گائیں دودھ دیتی رہیں!
میں نے نہیں دیکھا ان گاؤں کو، اُن کے جھونپڑے بے شک
خدا کے پاؤں کا نشان ہیں
چاندنی وہاں کلام کی پہنائی کو روشن کرتی ہے
بے شک اُدھر والے گاؤں میں مٹی کی دیواریں چھوٹی ہیں
لیکن گاؤں کے لوگ جانتے ہیں کہ شقیق کس پھول کا نام ہے
بے شک وہاں پانی نیلا ہے،
کلیاں کھلتی ہیں، گاؤں والے جانتے ہیں
کیسا گاؤں ہوگا وہ
اُس کے باغوں کی کلیاں گیتوں سے بھری رہیں
ندی کنارے رہنے والے پانی کو خوب سمجھتے ہیں
انھوں نے گدلا نہیں کیا پانی کو، ہم بھی
پانی کو گدلا نہ کریں

نادر نادر پور

تہران میں ۱۹۲۹ع میں ولادت ہوئی ۔ مصوری اور شاعری کا شوق اپنے والدین سے ورثے میں ملا ہے ۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم تہران کے مدارس میں ہوئی ۔ فرانسیسی زبان اور ادب کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے تین سال پیرس میں بسر کیے ۔ نو سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا ۔ شروع میں ڈاکٹر مہدی حمیدی اور استاد شہریار سے کسبِ فیض کیا اور پرویز ناتل خانلری اور فریدون تولّلی کے زیرِ اثر شعر کہتے رہے ۔ بعد میں جب نیما کے کلام سے آشنائی ہوئی تو اُس کے رنگ میں شعر کہنا شروع کیا ۔ اب تک چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں ، جن کے نام حسبِ ذیل ہیں : "چشمہا و دستہا" ، "دخترِ جام" ، "شعرِ انگور" اور "سرمۂ خورشید" ۔ ایک جیبی انتخاب بھی بازار میں ملتا ہے ۔ دو نئے مجموعے مرتّب کرنے میں مصروف ہیں ، جن کے نام "گیاہ و سنگ ، نہ آتش" اور "از آسمان تا ریسمان" تجویز کیے گئے ہیں ۔ زیر نظر مجموعے کے لیے اُن کی نظمیں جیبی انتخاب سے لی گئی ہیں ۔ "آسمان سے ریسمان تک" خود مصنف سے ملی ہے ۔

حماسه ای در غروب

ز پنهانگاه جنگلهای خاموش خزان دیده
بسویت باز خواهم گشت ، ای خورشید ، ای خورشید !
ترا با دست ، سوی خویش خواهم خواند
ترا با چشم ، سوی خویش خواهم خواند
ترا فریاد خواهم کرد ، ای خورشید ، ای خورشید !

من اکنون قطره های ریز باران را
که همچون بال زنبوران خواب آلود میریزد
بروی غنچهٔ چشمان خود احساس خواهم کرد
من اکنون برگها را چون ملخها از زمین پرواز خواهم داد
من اسفنج کبود ابرها را لمس خواهم کرد
وزان آبی بروی آتش پالیز خواهم ریخت
سپس آهنگ دیدار تو خواهم کرد ، ای خورشید، ای خورشید !

من اکنون کوله باری سهمگین بردوش خود دارم
عجائب کوله باری تلخ و شیرین را بهم کرده
عجائب کوله باری توشهٔ شبهای بیداری
عجائب کوله باری هدیهٔ روزان بهاری

در او گنج نوازشها

در او رنج نیایشها

در او رنج نمایشها

در او فریاد های مستی و هستی

در او اندوهِ ایامِ تهیدستی

من اکنون کوله بار بسته ام را پیش چشمت باز خواهم کرد ،

ای خورشید ، ای خورشید !

من از خمیازه های دره ها و خواب خندقها

من از آشوب دریا ها و از تشویش زورقها

سخن آغاز خواهم کرد

من از تاریکیِ شبها و از تنهائیِ پلها

من از نجوای زنبوران و از بی تابی گلها

سخن آغاز خواهم کرد

من از سوسوی فانوسی که پشت شیشه میسوزد

من از برقی که کوه و آسمان را با نخی باریک میدوزد

من از بیلی که بردوش نحیف آبیاران است

من از گیلاس بن های گل آورده

— که در صبح بهاران ، پایکوب باد و باران است ـ

ترا آگاه خواهم کرد ، ای خورشید ، ای خورشید !

من اکنون در خزانی بی بهار آواز می خوانم

من اکنون در شبِ تنهائیِ خود پیش میرانم
شب بی ماه در من لانه میسازد
عصایم در گل نرم بیابان ریشه می بندد
درختی در کنار راه میروید
درختی در کنارم راه میپوید
—عصای کوریش در دست و بار پیریش بر دوش ـ
—عصای کوریم در مشت و بار پیریم بر پشت ـ
به رفتن ، هر دو میکوشیم
من و او — هر دو — خاموشیم
من و او — هر دو — از خاکِ بیابان آب می نوشیم
من از این همسفر روزی ترا آگاه خواهم کرد ، ای خورشید ،
ای خورشید !
افق خالی است ، اما من پُر از ابرم
پُر از ابر غبار افشان بی باران
درون چشمه ، نقش خویش را بر آب می بینم
کنار چشمه ، آبِ زندگی را خواب می بینم
ازین خوابی که مینوشد وجودم را
شبی بیدار خواهم شد
شتاب آلوده ، در گودال دستم آب خواهم خورد
هجوم ماهیان تشنه را از یاد خواهم برد
نهالی تازه در من ریشه خواهد کرد
و بازوی بلند شاخسارش را

بدور گردن من حلقه خواهد کرد ، ای خورشید ، ای خورشید !

ترا گم کرده بودم من
ترا در خوابهای کودکی گم کرده بودم من
ترا بار دگر جستم

(—درون آخرین فریاد های ناهشیواری —)
ترا در خود رها کردم
ترا از نو صدا کردم
ترا جستم میان مرزهای خواب و بیداری
وزین پس با تو خواهم زیست ، ای خورشید ، ای خورشید !

من اکنون در غروب انتظارم راه میپویم
ترا همچون حریقی در کران این شب تاریک میجویم
و در پایان این شب زنده داریها
و در آنسوی این چشم انتظاریها
ترا بار دگر در خویش خواهم دید ، ای خورشید، ای خورشید !

در آن شب ، در شب دیدار
غباری نرم تر از آنچه در شبهای طوفانی
ز روی کشتزاران سپید پنبه برمیخاست
میان تپه های ماهتابی خیمه خواهد زد

و من در بهشت آن خیمه
بسان شعله ای در خرمن پنبه
به رقصی آتشین آغاز خواهم کرد ، ای خورشید، ای خورشید!
و در پایان آن شب ، آن شب دیدار
ز پنهانگاه جنگلهای خاموش خزان دیده
بسویت باز خواهم گشت
ترا با چشم، سوی خویش خواهم خواند
ترا با دست ، سوی خویش خواهم خواند
ترا آواز خواهم داد
ترا فریاد خواهم کرد ، ای خورشید ، ای خورشید!

غروبِ آفتاب کا رجز

سنسان خزاں زدہ جنگلوں کی کپھاؤں میں
تیری طرف لوٹ آؤں گا ، اے سورج ! اے سورج !
ہاتھوں سے تجھے اپنی طرف بلاؤں گا
آنکھوں سے تجھے اپنی طرف بلاؤں گا
تجھے پکاروں گا ، اے سورج ! اے سورج !

میں ابھی بارش کے باریک قطروں کو
جو نیند میں مست زنبوروں کے مانند گر رہے ہیں
اپنی آنکھوں کی کلیوں کے اوپر محسوس کروں گا

میں ابھی پتوں کو مکڑی دل کی طرح زمین سے اڑاؤں گا
میں بادلوں کے نیلے اسفنجوں کو چھوؤں گا
پھر ان سے خزاں کی آگ پر پانی نچوڑوں گا
پھر تیرے دیدار کی تمنا کروں گا ، اے سورج ! اے سورج !
ابھی میرے کندھے پر گمبھیر تھیلا لدا ہوا ہے
عجیب تھیلا ، جس کے اندر تلخ و شیریں یک جا
عجیب تھیلا ، بیداری کی راتوں کا توشہ
عجیب تھیلا ، بیماری کے دنوں کا تحفہ
اس میں مہربانیوں کے خزانے
اس میں مناجاتوں کے دکھ
اس میں مستی و ہستی کی فریادیں
اس میں تہی دستی کے دنوں کے غم
میں ابھی اپنے بند تھیلے کو تیری آنکھوں کے سامنے کھولوں گا ، اے سورج ! اے سورج !

میں ، وادی کی انگڑائیوں سے ، اور خندقوں کے خوابوں سے ،
میں ، سمندروں کے ہنگاموں اور کشتیوں کی پریشانیوں سے
اپنی بات شروع کروں گا
میں ، راتوں کی تاریکیوں ، اور ٹیلوں کی تنہائیوں سے
زنبوروں کی سرگوشیوں اور پھولوں کی بے تابیوں سے
اپنی بات شروع کروں گا

میں، اس دیئے کی مدھم لو سے جو شیشے کے پیچھے جلتا ہے
میں، اس بجلی سے جو پہاڑوں اور آسمانوں کو ایک ہی باریک دھاگے میں پرو دیتی ہے
میں، اس بیلچے سے جو کسان پانی دیتے وقت اپنے نازک کندھوں پر اٹھاتے ہیں
میں، چیری کے ان پودوں سے جو پھولوں سے بھر چکے ہیں
اور جنھیں اب بہار کی صبحیں، ہوا اور بارش روند رہی ہے
تجھے آگاہ کروں گا، اے سورج! اے سورج!

میں ابھی ایک بے بہار خزاں میں گیت گا رہا ہوں
میں ابھی اپنی سونی رات کی مسافت طے کر رہا ہوں
ایک بے چاند رات میرے اندر گھونسلا لگا رہی ہے
میری لاٹھی بیابان کی نرم نرم مٹی کے اندر جڑیں پکڑ رہی ہے
اس سے ایک درخت راستے کے کنارے اُگ آیا ہے
درخت جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے
—اس کے ہاتھ میں اندھے کی لاٹھی اور کندھے پر پیری کا بوجھ—
ہم دونوں سرگرمی سے چل رہے ہیں
میں اور وہ — دونوں — خاموش ہیں
میں اور وہ دونوں بیابان کی مٹی سے پانی پیتے ہیں
میں ایک دن تجھے اس ہم سفر کا حال سناؤں گا،
اے سورج! اے سورج!

افق خالی ہے ، لیکن میں بادلوں سے بھرا ہوا ہوں
بارش سے خالی ، خاک اڑانے والے بادلوں سے بھرا ہوا ہوں
چشموں کے اندر پانی میں اپنا عکس دیکھتا ہوں
چشموں کے کنارے آبِ حیات کے خواب دیکھتا ہوں
اس نیند سے جو میرے وجود کو نگلتی جا رہی ہے
میں ایک رات جاگ اٹھوں گا
جلدی میں اوک سے پانی پیوں گا
پیاسی مچھلیوں کے جھرمٹ بھول جاؤں گا
ایک نیا پودا میرے اندر جڑیں پکڑ لے گا
اور اپنی ٹہنیوں کے اونچے لامبے بازوؤں سے
میری گردن میں حلقہ ڈال دے گا ،

اے سورج ! اے سورج !

میں نے تجھے کھو دیا تھا
میں نے تجھے بچپن کے خوابوں میں کھو دیا تھا
تجھے میں نے دوبارہ پا لیا
(— بے ہوشی کی آخری فریادوں کے اندر—)
میں نے تجھے اپنے اندر کھلا چھوڑ دیا
از سرِ نو تجھے پکارا
تجھے میں نے خواب اور بیداری کی سرحدوں پر پا لیا
آج کے بعد میں تیرے ہی ساتھ جیوں گا ،

اے سورج ! اے سورج !

"میں ابھی انتظار کے غروب میں چل رہا ہوں
تجھے اِس تاریک رات کے کنارے جلتی ہوئی آگ کے مانند
پا لیا ہے
اور اُن شب زندہ داریوں کے خاتمے پر ،
اور اُن انتظار میں کھلی آنکھوں کے اُس پار ،
تجھے دوبارہ اپنے اندر پالوں گا ، اے سورج ! اے سورج !

اُس رات ، اُس دیدار کی رات
ایک غبار جو طوفانی راتوں کے اندر
کپاس کے سفید سفید کھیتوں پر اُٹھا تھا
اُس سے کہیں نرم تر غبار
چاندنی میں چمکتے ہوئے ٹیلوں کے درمیان خیمہ ڈال دے گا
اور "میں اس خیمے کے پیچھے
کپاس کے ڈھیروں کے اندر ، چنگاری کے مانند ،
ایک آتشیں رقص کا آغاز کروں گا ، اے سورج ! اے سورج !

اور اُس رات ، اُس دیدار کی رات کے ختم ہونے پر
سنسان خزاں زدہ جنگلوں کی اوٹ سے نکل کر
"میں پھر تیری جانب لوٹوں گا
تجھے اپنی آنکھوں سے اپنی طرف بلاؤں گا
تجھے اپنے ہاتھوں سے اپنی طرف بلاؤں گا
تجھے آواز دوں گا
تیرے لیے فریاد کروں گا ، اے سورج ! اے سورج !

نقاب و نماز

نماز شام غریبان چو گریه آغازم
به مویه های غریبانه قصه پردازم
به یاد یار و دیار آنچنان بگریم زار
که از جهان ره و رسم سر بر اندازم
(حافظ)

ز لابلای ستونها سپیده بر میخاست
و من در آینه خود را نگاه میکردم:
بسان تکه مقوای آبدیدهٔ زرد
نقاب صورتم از رنگ و خط تهی شده بود
سرم چو حبهٔ انگور زیر پا مانده
بسطح صاف بدل گشته بود و حجم نداشت
و در دو گوشهٔ آن صورت مقوائی
دو چشم بود که از پشت مردمکهایش
زلال منجمد آسمان هویدا بود

ز پشت شیشه افق را نگاه میکردم
سپیده از رحم تنگ تیرگی میزاد
و آسمان سحر گاهان

بسان محفل فرسوده نخ نما شده بود
ستاره ها همه در خواب میدرخشیدند
و من ببانگ خروسان ، نماز میخواندم
حضور قلب من از من رمیده بود و ، نماز
ببازی عبث لفظها بدل شده بود
و لفظها همگی از خلوص ، خالی بود !
نماز پایان یافت
و من در آینه ، تصویر خویش را دیدم :
حصار هستی ام از هول نیستی پر بود
هوار حسرت ایام برسرم میریخت
و من چو برج خراب از هراس ریزش خویش
بزیر سایهٔ نسیان پناه میبردم
و زان دریچه — که از عالم غریبی من
رهی بسوی جهان های آشنائی داشت ـ
بدان دیار مه آلوده راه میبردم :
بدان دیار مه آلوده ،
که آفتاب درآن نور لاجوردی داشت
و برگ و ساقهٔ گلها برنگ باران بود
پناه میبردم

درآن دیار مه آلوده ، روز جان میداد
و من نگاه به سیمای ماه میکردم

و بازگشت هزاران غم گریخته را
— چو گله های گریزان سار های سیاه —
ز لابلای ستونها نگاه میکردم

درآن دیار مه آلوده ، روزجان میداد
و شب چو کودکی از بطن روشنی میزاد
من از سپیده بسوی غروب میراندم
و با صدای مؤذن نماز میخواندم
حضور قلب من از من رمیده بود و ، نماز
ببازی عبث لفظها بدل شده بود
و لفظها همگی از خلوص ، خالی بود !
نماز ، دیر نپائید
و نیمه کاره رها شد
و من در آینه ، تصویر خویش را دیدم :
بسان تکه مقوای آبدیدهٔ زرد
نقاب صورتم از رنگ و خط تهی شده بود
و برق ناخوش چشمم ز تب خبر میداد
سکوت آینه سنگین بود
و من بخواب فرو رفتم
وقاب آینه از عکس من تهی گردید
نسیم ، پنجره را بست
و بانگی از دل آئینهٔ تهی برخاست

که ای بخواب فرو رفته !
نقاب مندرس خویش را ز چهره برانداز
و آن نماز رها کرده را دوباره بیاغاز !

دهان پنجره از مژدهٔ سحر پر بود
سپیده از رحم تنگ تیرگی میزاد
من از غروب بسوی سپیده میراندم
و باصدای خروسان ، نماز میخواندم...

نقاب اور نماز

ستونوں کے درمیان اجالا اٹھ رہا تھا
اور میں آئینے میں اپنی صورت دیکھ رہی تھی
پانی میں بھیگے ہوئے زرد گتے کے ٹکڑے کے مانند
میری صورت کی نقاب کے رنگ اور خط اڑ چکے تھے ،
میرا سر پاؤں تلے مسلے ہوئے انگور کے دانے کے مانند
چپٹا ہوگیا تھا اور اس کا کوئی حجم باقی نہ رہا تھا
اور اس دبلے چہرے کے دو کونوں میں
دو آنکھیں تھیں ، جن کی پتلیوں کے پیچھے سے
آسمان کا شفاف جما ہوا دریا نظر آ رہا تھا ۔

میں شیشے کے پیچھے سے افق کو تک رہی تھی
اجالا تاریکی کے تنگ رحم سے جنم لے رہا تھی

اور صبح کا آسمان
پرانے مخمل کے مانند تھا جس کے بھوسڑے نکل آئے ہوں
ستارے نیند میں جھلملا رہے تھے
اور میں مرغوں کی بانگ پر نماز پڑھ رہی تھی
میرا حضورِ قلب مجھ سے رخصت ہو چکا تھا، اور نماز
لفظوں کا بے کار کھیل بن کر رہ گئی تھی
اور لفظ سب کے سب خلوص سے عاری۔

نماز ختم ہوئی
اور میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی
میری زندگی کی چار دیواری لیستی کے ہـول سے بـر تھی
حسرتِ ایام کا ملبہ میرے سر پر گر رہا تھا
اور میں ایک اجڑے ہوئے مینار کے مانند، اپنے گرنے کے خوف سے
فراموشی کے سائے میں پناہ لے رہی تھی
اور اس دریچے سے — جس کے اندر پردیس کے دنوں سے لے کر اب تک
آشنائی کی دنیاؤں کا ایک راستہ کھلا رہا تھا —
میں اس کہر میں لپٹے ہوئے شہر کی طرف رواں تھی۔
اس کہر میں لپٹے ہوئے شہر کی جانب
جہاں دھوپ کا رنگ گہرا نیلا تھا
اور پھولوں کی پتیاں اور کونپلیں بارش کی طرح بے رنگ

میں اُس شہر میں پناہ لے رہی تھی

اُس کہر میں لپٹے ہوئے شہر میں دن سسکیاں لے رہا تھا
اور میں چاند کے چہرے کو تک رہی تھی
اور ہزاروں بچھڑے ہوئے غموں کی واپسی کی راہ
— سیاہ تلیروں کی تیز اُڑتی ہوئی ڈاروں کے مانند —
میں، ستونوں کے درمیان تک رہی تھی۔

اُس کہر میں لپٹے ہوئے شہر میں دن سسکیاں لے رہا تھا
اور رات بچے کے مانند، روشنی کے بطن سے پیدا ہو رہی تھی
میں اُجالے سے غروب کی جانب چل رہی تھی
اور موذّن کی آواز پر نماز پڑھ رہی تھی
میرا حضورِ قلب مجھ سے رخصت ہو چکا تھا، اور نماز
لفظوں کا بے کار کھیل بن کر رہ گئی تھی
اور لفظ سب کے سب خلوص سے عاری۔

نماز میں زیادہ دیر نہیں لگی
میں نے آدھی ہی پڑھ کر چھوڑ دی
اور میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی
بھیگے ہوئے گتے کے زرد ٹکڑے کے مانند
میری صورت کی نقاب کے رنگ اور خط اُڑ چکے تھے
اور میری آنکھوں کی ناخوشگوار چمک بخار کا پتہ دے رہی تھی

آئینے نے گہری چپ سادھ لی

اور میں سو گئی

اور آئینے کا چوکھٹا میرے عکس سے خالی ہو گیا

نسیم نے کھڑکی بند کردی

اور آئینے کے سونے دل سے ایک آواز بلند ہوئی

کہ اے نیند کی ماتی !

اپنی پھٹی پرانی نقاب کو چہرے سے ہٹا

اور اس چھوڑی ہوئی نماز کو پھر سے شروع کر

دریچے کا منہ صبح کی نوید سے پُر تھا

اُجالا تاریکی کے تنگ رحم سے پیدا ہو رہا تھا

میں غروب سے اُجالے کی طرف بڑھ رہی تھی

اور مرغوں کی بانگ پر نماز پڑھ رہی تھی —

بعد از هزار سال

بعد از هزار سال
یکروز صبح ، لحظهٔ زادن فرارسید
فریاد دردناک زمین در گلو شکست
زهدان او چو حلقهٔ چاهی دهان گشود
من همچو کودک از تن گرمش جدا شدم
آنگاه ، شور آتش دردش فرو نشست
برخاستم ز خاک
در حلقهٔ طلائی چشمم ، نگاه صبح
تابید همچو پرتو خورشید در نگین
اکنون نسیم در دلِ من بال میزند
اکنون درون سینهٔ من می تپد زمین
اکنون بهار در دل من لانه کرده است :
من رویش سپید هزاران جوانه را
بر شاخه های لخت
من بازی کبود هزاران ستاره را
در چشمه های دور
من جنبش شبانهٔ هر ابر پاره را
در آسمان ژرف

من گردش عصارهٔ گرم حیات را
من ساقهٔ گیاه تر ، احساس می کنم
من نبض بیصدای جاد و نبات را
در مغز و پوستم
در خون و گوشتم
چون ضربه های قلب خود احساس می کنم
پای مرا چو ریشهٔ بی آب نخل پیر
در ژرفنای خاک ، بزنجیر بسته اند
اما هنوز ، دست من از لابلای ابر
— مانند مشت بستهٔ گلدسته های شهر —
سوی ستاره هاست
در پنجه های سوخته اش مشغل دعاست !

با من دعا کنید
ای شاخه های خشک ،
ای دستهای سرد نوازش نیافته !
ای چشمه های دور ،
ای دیدگان کور ،
ای در شما ستارهٔ شادی نتافته !
یار شما منم
من با ستاره ها ،
من با پرنده ها ،

من با شکوفه های سحر ، زاده میشوم
من با نسیم هر نفس آشنا ، چو موج
از تو برای زیستن آماده میشوم

چون مشت خشمگین و گره خوردهٔ درخت
خورشید را میان دو دستم گرفته ام
خورشید در من است
در من ، اجاق معجزهٔ روز ، روشن است. . . !

ہزاروں سال بعد

ہزاروں سال بعد
ایک دن صبح سویرے پیدائش کا دن آ پہنچا
دردِ زِہ کی چیخوں سے زمین کا گلا رُندھنے لگا
اُس کا رِحم کنوئیں کے دہانے کے مانند کھل گیا
مَیں بچے کی طرح اُس کے گرم گرم بدن سے الگ ہوگیا
اُس وقت ، اُس کے درد کی آگ کا جوش ٹھنڈا ہوگیا
مَیں خاک سے بلند ہوا
میری آنکھوں کے سنہرے حلقوں میں صبح کی نگاہ
جھلک اٹھی ، جیسے سورج کا پرتو کسی نگینے میں
اب نسیم میرے دل کے اندر لہرا رہی ہے
اب زمین میرے دل کے اندر دھڑک رہی ہے

اب بہار نے میرے دل میں آشیانہ بنا لیا ہے
مَیں ، ہزاروں کونپلوں کی سفید روئیدگی کو
ننگی شاخوں پر
مَیں ، ہزاروں ستاروں کے نیلگوں چھل کو
دُور افتادہ چشموں میں
مَیں ، بادل کے ہر ٹکڑے کی رات بھر آوارگی کو
گھرے آسمان میں
مَیں ، زندگی کے گرم گرم رس کی گردش کو
نم آلود گھاس کے ڈنٹھلوں میں
محسوس کرتا ہوں ۔

مَیں ، پتھروں اور سبزے کی خاموش نبض کو
اپنے مغز و پوست میں
اپنے خون اور گوشت میں
اپنے ہی دل کی دھڑکنوں کے مانند
محسوس کرتا ہوں ۔

میرے پاؤں کھجور کے بوڑھے درخت کی سوکھی جڑوں کے مانند
پاتال میں کسی زنجیر سے باندھ دیے گئے ہیں
لیکن ابھی میرے ہاتھ بادلوں کے درمیان
— شہر کے میناروں کی بند مٹھیوں کے مانند —
ستاروں کی جانب اٹھے ہیں

اپنے جھلسے ہوئے پنجوں میں دعاؤں کی مشعل لیے
میرے ساتھ مل کر دعا کرو
اے سوکھی ہوئی ٹہنیو!
اے محبت کو ترسے ہوئے ہاتھو!
اے دور افتادہ چشمو!
اے نابینا آنکھو!
جن میں کبھی کوئی خوشی کا ستارہ نہیں چمکا
تمہارا دوست میں ہوں
میں، ستاروں کے ساتھ
میں، پرندوں کے ساتھ
میں، صبح کی کلیوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہوں
میں، ہر جانی پہچانی سانس کی نسیم کے ساتھ، موجوں کے مانند
از سرِ نو جینے پر تیار ہو جاتا ہوں۔

درختوں کی خشم آلود، گرہ خوردہ، مٹھیوں کے مانند
میں نے سورج کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا ہے
سورج خود میرے اندر ہے
میرے اندر دن کی کرامات کا آتشدان روشن ہے ––

شیهه‌ٔ خاموش

کوه ، زانوزده چون اسب زمین خورده براه
سینه انباشته از شیههٔ خاموش هلاک
مغز خورشید پریشان شده بر تیزی سنگ
چون سواری که بیک تیر ، در افتاده بخاک

ناخن از درد فروبرده درون شن گرم
سینه مالیده به گرمای تب آلود زمین
لب تاول زده اش سوخته از داغ عطش
خونش آمیخته با روشنی بازپسین

چشمش از حسرت آبی که نیابد همه عمر
محدود همچو سگی هار ، بدنبال سراب
بیم دارد که چو لب تر کند از چشمهٔ دور
آتش سرخ زبانش فکند شعله در آب

آسمان ، کاسهٔ براق لعاب اندودی است
که از او قطرهٔ آبی نتراویده برون
تشنگی در رحم روسپی پیر زمین
نطفه ای کاشته از شهوت سوزان جنون

کوره راهی که خط انداخته بر پشت کویر
جلد ماری است که خالی شده از خنجر خویش
گرد بادی که برانگیخته گرد از تن راه
غول مستی است که برخاسته از بستر خویش
گون از زور عطش پنجه فروبرده بخاک
تا مگر درد جگر سوز خود آرام کند
زخم چرکین ترکهای زمین منتظر است
تا مگر مرهمی از ظلمت شب، وام کند

چشمه ای نیست که در بستر خشکیدهٔ جوی
سینه مالان بخزد چون تن لغزندهٔ مار
کوه و خورشید، هراسیمه بهم می نگرند
اسپ جان می سپرد تشنه، در آغوش سوار!

خاموش ہنہناہٹ

پہاڑ گھٹنوں کے بل پڑا ہوا
اُس گھوڑے کے مانند جو سرِ راہ زمین پر گر پڑا ہو
اُس کا سینہ موت کی خاموش ہنہناہٹ سے بھرا ہوا
سورج کا دماغ نوکیلے پتھروں پر بکھرا ہوا
اُس سوار کے مانند جو ایک ہی تیر سے ڈھیر ہو گیا ہو۔

درد کے مارے اس نے اپنے سُم تپتی ہوئی ریت پر گاڑ دیے ہیں
اور وہ اپنا سینہ زمین کی دہکتی ہوئی حدّت پر رگڑ رہا ہے
اس کے چھالوں سے بھرے ہوئے ہونٹ پیاس کے زخموں سے
جل گئے ہیں
اس کا لہو روشنی کی آخری کرنوں کے ساتھ گھل مِل گیا ہے۔

اس کی آنکھیں اس پانی کی حسرت میں، جس کی اس نے عمر بھر
بوند تک نہیں پائی
دیوانے کتے کے مانند سراب کے تعاقب میں دوڑ رہی ہیں
ڈرتا ہے، اگر اس نے کسی دُور افتادہ چشمے سے
اپنے ہونٹ تر کرنے کی کوشش کی تو کہیں
اس کی زبان کے لال لال شعلے پانی میں آگ نہ لگا دیں۔

آسمان ایک چمکتا ہوا روغنی پیالہ ہے
جس سے پانی کی ایک بوند تک نہیں ٹپکتی
پیاس نے زمین کی بوڑھی قحبہ کے رحم کے اندر
دیوانگی کی بھڑکتی ہوئی شہوت کا
نُطفہ بو دیا ہے۔

ایک باریک پیچیدہ راستہ جس نے صحرا کی پشت پر
خراش ڈال دی ہے
گویا سانپ کی کینچلی کے مانند ہے، جس سے اس کا خنجر
نکل گیا ہو

کوئی بگولا ہے جو راستے کے جسم سے گرد اڑا رہا ہو
کوئی مست غول ہے
جو ابھی ابھی اپنے بستر سے اٹھا ہو۔

جھاڑیوں نے پیاس کی شدت سے اپنے پنجے زمین میں
گاڑ دیے ہیں
تا کہ اپنے جگر سوز درد کو تسکین دے سکیں
زمین کی درزوں کے گندے ناسور
رات کی تاریکی سے مرہم مانگتے ہیں۔

ندی کی خشک تہہ میں کوئی چشمہ نہیں
جو سانپ کے لرزتے ہوئے جسم کے مانند سینے کے بل چل سکے
پہاڑ اور سورج سراسیمہ ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں
گھوڑا اپنے سوار کے پہلو میں پیاسا جان توڑ رہا ہے۔

از آسمان تا ریسمان

درخت معجزه خشکیده ست
و کیمیای زمان ، آتش نبوت را
بدل به خون و طلا کرده ست
و رنگ خون و طلا ، بوی کشتزاران را
ز یاد هدهده های ترانه خوان برده ست
و آفتاب ، مسیحای روشنائی نیست
و ابر ها همه آبستن زمستانند
و جویها همه در سیر بی تفاوت خویش
به رودخانهٔ بی آفتاب می ریزند
و کوچه ها همه در رفتن مداومشان
به نا امیدی بن بستها یقین دارند .

پرنده ها دگر از گوشت نیستند ،
پرنده ها همه از وحشتند و از پولاد
و فضله هاشان از آفت است و از آتش
اگر به شهر فروریزد :
دهان به قهقههٔ مرگ می گشاید شهر
و در فضایش ، چتری سیاه می روید

و مادرانش ، فرزند کور می زایند
و دخترانش ، گیسو به خاک می ریزند
و عابرانش ، در نور تند می سوزند
و پوستهاشان ، از دوش اسکلتهاشان
فراخ تر ز شنلها به زیر می افتد
و نقش سایهٔ آنان به سنگ می ماند
اگر به دشت فروده آید :
جنین گندم در بطن خاک می گندد
و تخم میوه بدل می شود به دانهٔ زهر
و گل به یاد نمی آورد که سبزه کجاست .
اگر در آب فرو افتد :
نژاد ماهی ، راهی به خاک می جوید
و خاک ، دایهٔ نامهربان تر از دریاست .

زمین ، سقوطش را هر شب به خواب می بیند
و بیم مردن ، عشق بزرگ آدم را
به عقل مور بدل کرده ست
که زندگی را در زیر خاک می جوید
و خانه هائی در زیر خاک می سازد .

چه روزگار غریبی :
برادری ، سخنی بیش نیست

و معنی لغت آشتی ، شبیخون است
پسر به خون پدر تشنه ست
و رودها همه از لاشه ها گرانبارند
و دام ماهی صیاد ها پر از خون است .

پیام دست ، نوازش نیست
و پنجه های جوان ، دیگر
به روی ساقهٔ نالان نی نمی لغزند
به روی لولهٔ سرد تفنگ می لغزند
و آنکه سایهٔ دیوار ، خوابگاهش بود
به خشت سینهٔ دیوار می فشارد پشت
و برق خندهٔ تیر
نگاه خیرهٔ او را جواب می گوید
واو ، دوباره در آغوش سایه می خوابد .

چه روزگار غریبی :
سحر ، پیمبر اندوه است
و شب ، مفسر نومیدی
و روشنائی در فکر رهنمائی نیست :
شعاع آینه ها ، چشم کاکلیها را
به سوی کوری جاوید رهنمون شده است
و مرد مار گزیده

ز ریسمان سیاه و سفید می ترسد
که ریسمان ، مار است و مار ، رشتهٔ دار
و دار ، نقطهٔ اوجی است
که آسمان را با ریسمان گره زده است
و آسمان ، همه در خواب و دار ، بیدار است

کسی به فکر رهائی نیست
دریچه های جهان ، بسته ست
و چشمها همه از روشنی هراسانند ـ
زمین ، شکوه کریمانهٔ بهارش را
ز شاخ و برگ درختان دریغ می دارد
و آسمان ، شب صاف ستارگانش را
نثار خاک دگر کرده ست ـ

آیا سروش سحرگاهان ،
تو روشنی را جاری کن
تو با درختان ، غمخوار و مهربان می باش
تو رودها را جرأت ده
که دل به گرمی خورشید بسپرند
تو کوچه ها را همت ده
که از سیاهی بن بست بگذرند
تو قلبها را چندان بزرگواری بخش

کہ تا چراغ حقیقت را

دوبارہ در شب نا باوری برافروزند

تو دستہا را آن مایہ ہوشیاری بخش

کہ دوستی را از برگہا بیاموزند

تو ، ای نسیم ، نسیم ای نسیم بخشایش ،

بہ ما بوز کہ گنہکاریم

بہ ما بوز کہ گرفتاریم - - -

آسمان سے ریسمان تک

موسیٰ کا درختِ معجزہ سوکھ گیا ہے

اور زمانے کی کیمیا نے نبوت کی آگ کو

لہو اور سونے میں بدل دیا ہے

اور لہو اور سونے کے رنگ نے کھیتوں کی خوشبو کو

گانے والے ہدہدوں کی یاد تک سے محو کر دیا ہے

اور اب سورج کسی روشنی کا مسیحا نہیں

اور بادل سرتاسر اپنے اندر جاڑوں کے موسم لیے ہیں

اور ندیاں تمام اپنے یکساں بہاؤ میں

ایک ایسے دریا کے اندر گر رہی ہیں ، جس پر دھوپ نہیں چمکتی

اور گلیاں تمام چلتی ہوئی

نومیدی کے بند کوچوں پر ایمان رکھتی ہیں ۔

اب پرندے گوشت کے بنے نہیں ہوتے

اب پرلدے تمام خوف اور فولاد کے بنے ہوتے ہیں
اور اُن کا فضلہ بلا اور آگ ہے ،
اگر شہر پر گرے
تو شہر کا شہر موت کے قہقہے لگاتا ہوا منہ کھول دے
اور اُس کی فضا میں ایک کالی چھتری آگ آئے
اور شہر کی مائیں اندھے بچے جننے لگیں
اور شہر کی بیٹیاں اپنے گیسو خاک میں رول دیں
اور اُس کے راہرو ایک تیز روشنی میں جل اٹھیں
اُن کا چمڑا جو اُن کے لبادوں سے بھی ڈھیلا ہے
نیچے گر پڑے
اور اُن کے سایوں کے نشان پتھر پر باقی رہ جائیں ۔
اگر میدان پر گرے
تو گیہوں کی نازائیدہ بالیاں خاک کے پیٹ میں گل سڑ جائیں
اور پھلوں کے بیج زہریلے دانوں میں تبدیل ہو جائیں
اور پھولوں کو یاد تک نہ رہے ، سبزہ کہاں ہے !
اگر پانی میں گرے
تو مچھلیوں کی پوری نسل زمین کی راہ لے
اور زمین سمندر سے بڑھ کر نامہربان دایہ ثابت ہو ۔

زمین ہر رات اپنی سرنگونی کے خواب دیکھتی ہے
اور مرنے کے خوف نے انسان کے عظیم عشق کو
چیونٹی کی عقل میں بدل دیا ہے ،

جو زندگی کو زمین کی تہہ میں ڈھونڈھتی ہے
اور زمین کے نیچے اپنے گھروندے بناتی ہے۔

کیسا بھکاری کا زمانہ ہے!
بھائی بندی کہنے کی بات رہ گئی ہے
اور صلح کے لفظ کے معنی راتوں کو چھاپا مارنا ہے
بیٹا باپ کے خون کا پیاسا ہے
اور ماہی گیروں کے جال لہو سے بھرے نکلتے ہیں۔

کوئی ہاتھ محبت کا پیغام نہیں دیتا
اور جوان ہاتھوں کی انگلیاں، اب
روتی ہوئی بنسری کی کونپلوں پر نہیں چلتیں
بندوق کی ٹھنڈی گولیوں کو رولتی ہیں
اور وہ شخص، دیوار کا سایہ جس کی خواب گاہ تھا
اب دیوار کے سینے کی اینٹوں پر ہیٹھ رگڑ رہا ہے
اور گولیوں کی ہنسی کی بجلی
اس کی چندھیائی آنکھوں کا جواب دیتی ہے
اور وہ پھر سے سایے کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا ہے۔

کیسا عجب زمانہ ہے!
صبح غم کا پیغام لاتی ہے
اور رات ناامیدی کی تفسیر سناتی ہے
اور روشنی کسی کو راستہ دکھانے کی پروا نہیں کرتی۔

آئینوں کے چمکارے کاکلی[1] کی آنکھوں کو
ہمیشہ کے اندھے پن کی جانب راہ دکھاتے ہیں
اور سانپ کا کاٹا
سیاہ و سفید رسّی سے ڈر جاتا ہے
کیونکہ رسی سانپ ہے ، اور سانپ سولی کا رسّا
اور سولی ایک بلند مقام ہے
جس نے آسمان اور ریسمان کو آپس میں باندھ دیا ہے
اور آسمان تمام نیند میں گم ہے اور سولی جاگ رہی ہے ۔

کسی کو نجات پانے کی فکر نہیں
دنیا کے سب دریچے بند ہیں
اور آنکھیں سب روشنی سے ڈرتی ہیں
زمین اپنی بہاروں کی شانِ کریمی کو
درختوں کی شاخوں اور پتّوں سے روک رہی ہے
اور آسمان نے اپنی اُجلی تاروں بھری راتیں
کسی اور ہی سرزمین کے لیے اٹھا رکھی ہیں
اے صبح کے فرشتے !
آ اور اپنا نور بہا
درختوں پر مہربان ہو اور ان کا غم خوار بن
دریاؤں کو یہ جرأت دے

۱ ۔ کاکلی : لارک ، جسے پکڑنے کے لیے آئینوں کے ذریعے چمکارا ڈالتے ہیں ۔

کہ وہ اپنا دل سورج کی حدّت کو سونپ دیں
کلیوں کو ہمت دے کہ وہ بند راستوں کی تاریکیوں سے دور رہیں

دلوں کو اتنی عظمت عطا کر
کہ وہ حقیقت کے چراغ کو
اِس بے یقینی کی رات دوبارہ روشن کریں ،
تُو ہاتھوں کو اتنا ہوش دے
کہ وہ دوستی کا سبق لہروں سے سیکھ لیں
اور اے نسیم ، نسیم ، اے بخشش کی نسیم !
ہم پر چل کہ ہم گنہگار ہیں
ہم پر چل کہ ہم مجبور ہیں ۔

منوچہر آتشی

۱۹۳۱ء میں خلیجِ فارس کے ساحلی شہرِ دہرود میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بندر بوشہر میں حاصل کی۔ بعد میں شیراز کے دانش سرائے مقدماتی (جونیر ٹیچرز ٹریننگ کالج) اور تہران کے دانش سرائے عالی (ہائی ٹریننگ کالج) سے ڈگری حاصل کی۔ ان کے یہ تین مجموعے چھپ چکے ہیں: "آہنگِ دیگر"، "آوازِ خاک" اور "دیدار در فلق"۔ اطالوی مصنف انیتسیو سلونے کے ناول "فانتا مارا" کا فارسی میں ترجمہ بھی اُن کے قلم سے ہے۔ پہلے قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے۔ کچھ عرصہ فریدون توللّی کے زیرِ اثر رہے۔ بعد میں نیما یوشیج کے تتبع میں نیا رنگ اختیار کیا۔ آج کل قزوین کے ہنرستانِ صنعتی (انڈسٹریل اسکول) میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے کے لیے نظمیں اُن کے مجموعے "آوازِ خاک" اور "دیدار در فلق" سے انتخاب کی گئی ہیں۔

آنانکه مرگ را سپری...

آنانکه بی هراسی،
بی عشوهٔ تشنجی از وحشت
باشتی نشستند
— با مرگ
آنانکه مرگ را، خوابی دراز و بی رویا،
انگاشتند

آنان،
با مرگ بر غنیمت هستی،
بیعت کردند
آنان طبیب پیر اجل را
— پاربخ،
هدیه،
جان دادند

آنان
از هول درد
از خوف سیل،
گردنه،
خوناب
از وحشت تلاطم،

آنان

در کام کوسه، سنگر کردند

آنان دلاوری را ستری
بر عورت سترونی از شور زندگی
بر عورت عقیمی از عشق
— که بی شکوه‌تر آفاق زیستن را،
تنها، رنگی
بهانهٔ مایهٔ ماندن می دارد
می دارند

آنانکه مرگ را سپر درد می کنند
آنانکه مرگ را،
درمان زخم چرکی یأس
آنانکه مرگ را رویائی...

من،

خار خشکبوتهٔ نام آنان را
آتشگران همت،
هرگز نکرده ام

من،

با تو

ای کرانهٔ پندارم
ای منظر تماشا،
— ای سبز!

من با تو

تا کرانهٔ پندار تو

ره در کریوه ،

گردنه ،

دره

در تنگه های واهمه ،

خواهم سپرد

من خوف مرگ را دم طاؤس لر

من هول مرگ را

— با تو

چتر ظریف

از تاب آفتاب هاویه

خواهم کرد

من

با تو غرور را سپری

— در هجوم مرگ

با تو خیال را آلا چیقی در تابستان فراغت ،

خواهم کرد

با تو دلاوری را ،

من ،

باد های تاختنی از هجوم خون

با تو تناوری را

— در چار باد درد

من ،

قایق رهائی

سوی جزیره های سلامت

و آرایش دوباره پیکار درد

خواهم کرد ـ

از انحنای دور. . .

آنک !

باران دیر آمده ،

می بارد

و ساقه های نازک خود را

در شیب های سوخته می کارد ـ

آنک زمین ،

— طول و متفکر

از خواب خشکسالی بر می خیزد

نبض هزار دانهٔ پوسیده

— از ترشک و پنیرک

آهنگ پر دوام روئیدگی دوباره می انگیزد

آنک !

باران !

با آنکه دیر آمده ،

می بارد -

ای خاک بکر !

— ای "خاصهٔ" بهارهٔ من !

باید که گاو آهن را

از چوب های تازه بپردازیم

باید که گاوها را فربه کنیم

باید که داس ها را

صیقل دهیم

باید برای ساز چرخ "چپاب" ها

لت های تازه بنویسیم

باید به بلبلان نخلستان

آهنگ های تازه بیاموزیم

ما ،

زنده ایم !

— من ،

تو . . .

ای خاک خوب من !

ای تپهٔ شقایق !

ما نیستیم آنان

— که مرگ را روبائی

آنان که مرگ را سپری

آنانکه مرگ را خوابی کردند . . .

جنھوں نے موت کو ڈھال . . .

جنھوں نے بغیر کسی خوف کے

بغیر کسی ڈر کی پیدا کی ہوئی ، تشنج کی عشوہ گری کے

موت کے ساتھ صلح کر لی

جنھوں نے موت کو ایک طویل نیند سمجھ لیا

جس کے اندر خواب تک نہ ہوں

اُنھوں نے

زندگی کی نعمت پر موت کو ترجیح دے کر

اُس سے بیعت کر لی

اُنھوں نے موت کے بوڑھے طبیب کی اُجرت میں

جان کا ہدیہ پیش کر ڈالا ۔

اُنھوں نے
دُکھ کے ڈر سے ،
سیلاب کے خوف سے ،
پُرخطر پہاڑی راستوں
اور لہروں کے خوف سے ،
تلاطم کی دہشت سے ،

اُنھوں نے
شارک مچھلی کے منہ میں جا پناہ لی ۔

وہ لوگ بہادری کو اُس عریانی کا پردہ سمجھتے ہیں
جو زندگی کے ذوق و شوق سے محروم اور عشق سے عقیم ہو
اُس عشق سے جو زندگی کے کناروں کو (جو شان و شکوہ
سے عاری ہیں)
ایک ہی رنگ میں رنگ دیتا ہے تاکہ اس طرح وہ دوام
پا سکیں ۔

جو لوگ موت کو اپنے دُکھوں کی ڈھال بنا لیتے ہیں
جو لوگ موت کو
مایوسی کے بہتے ہوئے ناسور کا درمان
جو لوگ موت کو خواب . . .
مَیں نے اُن لوگوں کی نیک نامی کے خشک جھاڑوں کو روشن
کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ۔

مَیں ،
تیرے ساتھ ،
اے میرے فہم کے آخری کنارے !
اے جانِ نظّارہ !
اے سانولی !
مَیں ، تیرے ساتھ ،
تیرے فہم کے آخری کنارے تک ،
پہاڑیوں کے ناہموار راستے ،
کٹھن راستے ،
درّے ،
واہموں کی تنگ وادیاں
طے کروں گا ۔
مَیں موت کے خوف کو مورچھل
مَیں ، موت کے ڈر کو
— تیرے ساتھ مل کر
دوزخی دھوپ سے بچنے کے لیے
ایک خوب صورت چھاتا بنا لوں گا ۔
مَیں ، تیرے ساتھ مل کر
موت کی اس یلغار میں
غرور کو اپنی ڈھال بنا لوں گا
اور تیرے ساتھ مل کر اپنے ایمان کو
فراغت کے تابستانوں میں

اپنا سائبان بنا لوں گا۔

تیرے ساتھ مل کر بہادری کو

میں،

جوشیلے لہو کے ساتھ دوڑتا ہوا، ہوا سے باتیں کرتا ہوا

گھوڑا بنا لوں گا

میں تیرے ساتھ مل کر

— درد کے مختصر لمحے میں

اپنی توانائی کو

میں،

سلامتی کے جزیروں کی طرف رہائی پانے کے لیے

کشتی بنا لوں گا

تاکہ درد کے مقابلے میں اپنی جنگ کی تیاری پھر سے کر سکوں۔

وہ دیکھو، دُور کی محراب سے...

وہ دیکھو

وہ برسات اُٹھی، جس کا بڑی دیر سے انتظار تھا

یہ برسات برس کر رہے گی

اور اپنی نازک کونپلیں

جلے ہوئے نشیبوں کے اندر بو کر رہے گی۔

وہ دیکھو ، زمین

جو ملول اور اداس تھی

خشک سالی کے خواب سے جاگ اٹھی

ہزاروں گلے سڑے دالوں کی نبضیں

— کدو اور ککڑی کے بیجوں سے

شادابی کا دائمی نغمہ گانے لگیں

وہ دیکھو ،

بارش !

اگرچہ دیر سے آئی ہے

لیکن برسنے لگی ہے

اے کنواری مٹی !

— اے میری بہار کی کھیتی !

آ ، کہ ہم اپنے ہلوں کو

نئی لکڑی سے بنائیں

آ ، ہم اپنی گایوں کو موٹا کریں

آ ، ہم اپنی درانتیوں کو پھر سے چمکائیں

آ ، ہم اپنے کنوؤں کے رہٹ کے سازوں کے لیے

نئی موسیقی تیار کریں

آ ، ہم اپنے نخلستانوں کی بلبلوں کو

نئے نئے آہنگ سکھائیں

ہم

زندہ ہیں

— میں

اور تُو ۔۔۔

—

اے میری پیاری زمین !

اے پھولوں سے لدے ہوئے ٹیلے !

ہم وہ نہیں

— جنھوں نے موت کو ایک خواب

جنھوں نے موت کو ایک ڈھال

جنھوں نے موت کو ایک نیند بنا لیا ۔ ۔ ۔

در انتهای شب

ها چه کس می توان گفت
که من اینجا هزارم هزاران نشسته به یکتن
که من اینجا هزاران
و . . . یکی می گریزد از این من
با نگاهی که ز اعماق تر شد
رنجم آفتاب دلم را
روی اشباح مغشوش هائیز
باغ پر پر شد و در شفق سوخت

های دیوار سرخ شفق
آنک ! آن یک سواریست خسته
یورغه می راند
تاین جنگل خهس شب ، اسب -

ها چه کس می توان گفت که دیده ام من
که خروسان فلق را
از پس کوه خوالدلد
وان شبیح - با هراسی نهفته

از تہ کوچۂ شہر بگریخت
و آفتاب بزرگ دل من
روی فرش تر برگہا ریخت
و ہزاران شبح سوی ہیولہ راندند
باچہ کس می توان گفت ؟ . . .
ہمہ سوزم لہانند و شعرم بہ دل ماند
صبح با کوچہ آمیخت

بھیگی رات

کس سے کہا جا سکے
کہ میں یہاں ایک جسم کے اندر ہزاروں بن کے بیٹھا ہوں
کہ میں یہاں ہزاروں —
اور— وہ ایک ہوں جو اس میں سے ڈرتا ہے
اس ایک نگاہ سے جو گہرائیوں میں تر ہوکر نکلی تھی
میں نے اپنے دل کے کئی سورج
خزاں کی دھندلائی ہوئی صورتوں کے اوپر بکھیر دیے
باغ کا پتا پتا الگ ہوکر شفق کے اندر جل گیا ۔

شفق کی سرخ دیوار کے دامن میں
وہ دیکھو ، ایک تنہا تھکا ہوا سوار
ابھی تک اپنے گھوڑے کو رات کے بھٹکے ہوئے جنگل میں
جنگل کے آخری کنارے کی طرف دُلکی چلائے لیے جا رہا ہے

کس سے کہا جا سکے کہ "میں نے خود دیکھا

کہ وادی کے مرغِ صبح کے وقت پہاڑ کے پیچھے سے آواز دے رہے تھے

اور وہ موہوم صورت — دل میں کوئی ڈر چھپائے

شہر کے کوچے کے آخری سرے سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

اور میرے دل کے عظیم سورج کے پتے

نم آلود فرش پر برس پڑے

اور ہزاروں موہوم صورتیں سونے راستوں کی طرف سرک گئیں۔

کس سے کہا جا سکے ؟ —

میرا مٹی کا دیا بجھ گیا اور شعر دل ہی میں رہ گئے

صبح، گلی کوچوں کے ساتھ یک جان ہو گئی۔

پرسش

این ابرهای سوخته‌ٔ سوگوار
تابوت آفتاب را بکجا می برند ؟
این بادهای تشنه ، هار و حریص وار
دنبال آبگون سراب کدام باغ
پای حصار های افق سینه می درند ؟

اکنون درخت لخت کویر
پایان نا امیدی
و آغاز خستگی کدامین مسافر است ؟

مرغان رهگذر
مرگ کدام قاصد گمگشته را
از جاده های پرت
بقریه می آورند ؟

ای شب ! بمن بگو
اکنون ستاره ها
نجوا گران مرثیهٔ عشق کیستند
هنگام عصر برسر دیوار باغ ما
باز آن دو مرغ خسته چرا می گریستند ؟

ایک سوال

یہ جلے ہوئے سوگوار بادل
سورج کے تابوت کو کہاں لیے جا رہے ہیں ؟
یہ پیاسی ہوائیں ، حریص اور دیوانہ وار
کس باغ کے نیلگوں سراب کے تعاقب میں
افق کے قلعوں کی دیوار کے پیچھے
گھبرائی ہوئی ، سراسیمہ چلی جا رہی ہیں ؟

اب صحراؤں کے ننگے درخت
کس مسافر کی نومیدی کی انتہا
اور کس کی خستگی کی ابتدا ہیں ؟

گذرتے ہوئے پرندے
کس گمشدہ قاصد کی موت کی خبر
دور دراز راہوں سے
گاؤں کی جانب لا رہے ہیں ؟
اے رات ! مجھے بتا
اب ستارے
کس کے عشق کا مرثیہ
چپ چاپ کانوں میں کہہ رہے ہیں ؟
اور شام کے وقت ، ہمارے باغ کی دیوار پر
وہ دو تھکے ہوئے پرندے کیوں
پھر سے رو رہے تھے ؟

یک روز

در دشت صبحگاهی پندارت
از جاده ای که در نفس مه نهفته است
چون عاشقان عهد کهن
با اسب بور خسته ،

می آیم من

در بامداد های بخار آلود
در عصر های خلوت بارانی
با تا به سر دو چشم درشت و سیاه
تو گوش با طنین سم مرکب منی ،
من ،
چون عاشقان عهد کهن
با اسب پای پنجره می مانم
بر پنجه های نرم تو لب می نهم به شوق
وآنگاه
همراه با تپیدن قلب نجیب تو
از جاده های در دل مه

می رانم

یک شب

خشمی سیه ز حوصلہ ها می برد شکیب
— خشم برادرانت شاید
و آنگاه در سکوت مہ آلود گرد شہر
برق و — نالہ ی —

یک بامداد سرد و بخار آلود
آندم کہ پشت پنجرہ با چشم پر سرشک
دشت بزرگ خالی را می پای
بازین و برگ کج شدہ اسب نجیب من
با شیہہ ی کہ نالہ ی من در طنین اوست
تا آشیان چشم تو می آید
زاندوہ مرگ تلخ من آشفتہ بال و دم
گردن بہ سوی پنجرہ می ساید

ایک دن

تیرے غرور کی صبح کے میدان میں
اس راستے سے جس پر کہر کی سانس چھا رہی ہے
پرانے زمانے کے عاشقوں کی مانند
اپنے تھکے ہوئے سرخ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار
میں آؤں گا۔

بھاپ سے آلودہ صبحوں میں ،
بارش کی سنسان شاموں میں
پاؤں سے سر تک دو کرخت اور سیاہ آنکھیں بنا ہوا
غرور کے گھوڑے کے سموں کی آواز میرے کانوں میں ،
میں ،
پرانے زمانے کے عاشقوں کی مانند
تیرے دریچے کے نیچے اپنے گھوڑے پر سوار ، رکوں گا
اور تیرے نرم نرم ہاتھوں پر شوق بھرے ہونٹ رکھ دوں گا
اور اس وقت
تیرے نیک دل کی دھڑکنیں ساتھ لیے
ان راستوں سے جن پر کُہر چھا رہی ہوگی
میں اپنا گھوڑا دوڑا لے جاؤں گا ۔

ایک رات
سیاہ غصہ ہمارا صبر لوٹ لے گا
ہمارے حوصلے پست کر دے گا
—غصہ ، شاید تیرے بھائیوں کا غصہ
اور اس وقت کہر آلود خاموشی میں جو شہر کے گرد چھا رہی ہوگی
بجلی کی کڑک — اور رونے کی پکار—

ایک ٹھنڈی صبح جب دھند چھا رہی ہوگی
جب تو دریچے کے پیچھے کھڑی آنسوؤں بھری آنکھوں سے

سنسان اور پھیلے ہوئے میدان پر نظر ڈالے گی
میرا نیک دل گھوڑا جس کی زین اور ساز آلٹ چکے ہوں گے
یوں ہنہناتا ہوا ، جیسے اس کی آواز میں میرا ہی نالہ بھرا ہو
تیری آنکھوں کے لشیمن تک آ نکلے گا
اور میری دل خراش موت کے غم میں اس کی ایال اور دُم
آشفتہ ہوگی
اور وہ تیرے دریچے کی سلاخوں پر اپنی گردن رگڑے گا۔

شاید

ارواح
از بادها پیاده شدند
وقتی که باد می خواند
— از کومه های ساحل مغشوش

شاید حکایتی
با بادهای وحشی باشد
که می تواند ، برکت را
— بیشتر
به کلبه های ساحلی ارزانی دارد

شاید
با بادها حکایت تلخی ست
که می تواند ، یکباره
انبوه ماهیان را
مرده ، به روی آب برانگیزد

شاید
از بادها
مردی بزرگ
مردی نجات دهنده ، برخیزد

شاید

ہا بادہا حکایتی ست

شاید کہ بادہا ،

بادلد

شاید

روحیں ،

ہواؤں کے کندھوں سے نیچے اتر آئیں ،

اس وقت جب ہوا چل رہی تھی اور

دھندلے کناروں کے جھونپڑوں پر سے گذر رہی تھی ۔

شاید ،

یہ وحشی ہوائیں

کوئی کہانی لائی ہیں

وہ کہانی جس کے دم سے کنارے کے جھونپڑوں کے اندر

اور برکت پھیل جائے ۔

شاید ،

ہوائیں کوئی زہریلی کہانی لائی ہیں

جس سے ناگہاں

سڑی ہوئی مچھلیوں کے ڈھیر

کنارے پر لگ جائیں ۔

شاید ،

ان ہواؤں میں سے

کوئی بڑا آدمی ،

کوئی نجات دینے والا ،

اٹھ کھڑا ہو ۔

شاید ،

ہوائیں کوئی کہانی لائی ہیں

شاید ہوائیں

ہوائیں ہیں ۔

یداللہ رؤیائی

۱۹۳۲ء میں دامغان کے ایک گاؤں جعفر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دامغان میں پائی اور بعد میں تہران کے دانش سرائے عالی سے ڈگری لے کر معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کے بعد تہران یونیورسٹی کے لا کالج سے سیاسی قانون میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ کچھ عرصہ وزارتِ خزانہ میں افسرِ مالیات رہے۔ کئی بھی فرموں میں مشیرِ مالیات رہ چکے ہیں اور مختلف اشاعتی اداروں کے مشیر بھی۔ آج کل ایران کے قومی ٹیلی ویژن میں محکمۂ حساب کے افسرِ اعلیٰ ہیں۔ ان کی نظموں کے یہ چار مجموعے چھپ چکے ہیں: "بر جادہ ہائے تہی"، "شعر ہائے دریائی"، "دلتنگی ھا" اور "از دوستت دارم"۔ بعض مشہور فرانسیسی شاعروں کی نظموں کے فارسی ترجمے بھی اُن کے قلم سے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد تنقیدی مضامین کے مصنف بھی ہیں۔ ایک تنقیدی کتاب "از کلمہ تا مصرع و از مصرع تا فورم" زیرِ تالیف ہے۔ جدید فارسی شاعری پر اُن کے کئی انٹرویو رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے کے لیے نظمیں چاروں مجموعوں سے انتخاب کی گئی ہیں۔

بر جاده های تهی

جاده ها خالی ست ،
خالی از گلهای جای پاست ، دشت
زخمها از پیکر شب لرم می ریزند
(زندگی در سوک اختر ها ست)

—ای غبار انگیز رقاصان پیراهن عدم !
لحظه ای خاموش !
زین غبار انگیزی پر نقش و پا کوبی لخت اندام
با نگاه زیرتاب خامش آهنگی ، که از آشوب
پا ها تان به من رانید ،
سست های کام تلخ آواز من راست تر ، در مستی
کمرنگ جاویدی که می دالید ، می رانید
لحظه ای خاموش !
ای برهنه های پا کوب ! ای غبار انگیز رقاصان
پیراهن عدم !

و برهنه های پا کوب ، از میان دودناک آنچه پا افشانشان در
خود برانگیزد ،

بانگی از خاکستر روزان خلوت را

(که از چشمی شیار اندوز، کین می خواست، مهر آموز)،

زیر پلهای طلائین نگاه زیرتاب خویش، درهم ریز می رانند -

و سرود زعفرانیشان، به زیر خیمهٔ ابریشم رقص فریبا خرمن،

گیسو افشان هر غزل در شیب هر تن،

پای می کوبند. . . .

—ای فناتان جلوهٔ جاوید هست!

جلوه هاتان بقعهٔ زرین به روی موج خامه گون

کوثر های مست!

جذبه تان بی رنگی پایان من را رنگ،

گاه من را رقص ها تان کهربا آهنگ!

جادوی نیرنگتان را اندکی ایست!

تا نگاهم، باقفا آشنا، در تان نسوزد

من نمی خواهم سپید افشانِ پاها را،

من نمی خواهم به جنبش های پیکرها، طنین لغزش اندام رویا را،

نفخهٔ آغوشها را و خمار چشم ها را -

با قفایم، بهشت هر لحظه پلی بشکسته ام

(رفته ها را منظری در چشم من نیست)

با منِ تان رحمی آخر، آه!

لحظہ ای خاموش !

زین غبار انگیزی ہر نقش وپا کوبی لخت الدام۔ ۔ ۔

جذبہ طوفان بستہ در پاہا
و طلائی ہای قبہ ہای رقص آسا ، طلائی تر ،
عاقبت را رنگ می ریزند ۔

جادہ ہا خالی ست ،
خالی از گل ہائی جائی پاہاست ، دشت
مردِ من ، برہلۂ پایان
(کہ با او لحظہ اش در انتظار لحظہ نیست) ،
استخوان بوسنگلاخ خاطرہ ہا می کشاند ۔
خاطرہ ہا خاک میگردند ۔
ضجہ اش در پیچ ہر رگ خشک ،
با درخش خامش فریاد ہایش ،
می نشاند برنگین التماس الماس :
—ای غبار انگیز۔ ۔ ۔ رقاصان ۔ ۔ ۔ پیراہنۂ ۔ ۔ ۔
ای برہنہ ہای ۔ ۔ ۔ پاکوب

سُونے راستوں پر

راستے سونے ہیں
میدان نقشِ پا کے پھولوں سے محروم ،

رات کے جسم سے زخم آہستہ آہستہ رستے ہوئے ،
(زندگی ستاروں کا ماتم کرتی ہوئی)

— اے عدم کے کٹھن راستے پر گرد اڑاتے ہوئے
رقص کرنے والو !
آن بھر کے لیے خاموش !
آن بھر کے لیے گرد اڑانے سے رک جاؤ
اس گرد سے جو تصویریں بنا رہی ہے
رک جاؤ اِس ننگے ناچ سے
یہ نگاہیں ، جھکی ہوئی نگاہیں ، بے صدا نگاہیں
جو تم اپنے پاؤں کے اس ہنگامے سے
میری طرف پھینک رہے ہو
یہ میرے قدموں کے بوجھ کو اور بھی بوجھل کر رہی ہیں
ایک ایسی ابدی مستی میں
جس کا رنگ معلوم نہیں ، تم جانتے ہی ہو —
لمحہ بھر کے لیے رک جاؤ
اے ننگے ناچنے والو ! اے عدم کے کٹھن راستے پر
گرد اڑاتے ہوئے رقص کرنے والو !
اور یہ ننگے ناچنے والے ، اس دھواں دھار میں سے جو ان کے
پاؤں پٹخنے سے بلند ہو رہا ہے
تنہائی کے دنوں کی راکھ سے ایک صدا

(وہ صدا جو ایک جھریوں سے بھری ہوئی آنکھ سے محبت
بھرا انتقام لینے کی ترغیب دیا کرتی تھی)
اپنی نگاہوں ، جھکی ہوئی نگاہوں کے سنہرے پلوں کے نیچے
سے بے ترتیب میری طرف پھینک رہے ہیں
اور اُن کا زعفرانی نغمہ رقص کے ابریشمی خیمے کے نیچے ڈھیر
ہو گیا ہے
اُن کی ہر غزل ہر جسم کے نشیب میں گیسو پھیلا رہی ہے
اور وہ ناچتے چلے جا رہے ہیں ——
—— تمہاری فنا اُس ہست کا ابدی جلوہ
اور تمہارا جلوہ مست کوثروں کی ملائی رنگ لہروں پر
ایک سنہرے گنبد کے مانند
تمہارا جوش و خروش میری آخری بے رنگی کا رنگ
تمہارا رقص میرے تنکے کے لیے کہربا
اپنا یہ فریب انگیز جادو تھوڑی دیر کے لیے روک لو
تا کہ میری نگاہیں جو پیچھے مڑکر نہیں دیکھ سکتیں
تمہارے وجود کے اندر بھسم نہ ہو جائیں
میں تمہارے پاؤں کا بکھیرا ہوا سفیدہ نہیں چاہتا
میں تمہارے لہراتے ہوئے جسموں سے ، اُن خوابناک
جسموں کی لغزش سے اٹھتی ہوئی گونج نہیں چاہتا
میں آغوشوں کی نکہت اور آنکھوں کا خمار نہیں چاہتا
میں نے اپنے پیچھے ہر لحظہ ایک پل توڑ دیا ہے

(میری آنکھوں میں گذرے ہوئے دنوں کا کوئی منظر باقی نہیں)

آخر مجھ پر رحم کھاؤ، آہ!
آن بھر کے لیے روک لو

یہ گرد سے اٹا ہوا رقص، یہ تصویروں سے بھرا ہوا لنگا ناچ ـــ

جوش نے ان کے پاؤں میں طوفان باندھ رکھے ہیں
اور ان کے رقص سے جو سنہرے گنبد بن رہے ہیں، وہ اور بھی سنہرے ہوتے جا رہے ہیں
اِن گنبدوں سے ان کی عاقبت رنگین ہوتی جا رہی ہے۔
راستے سُونے ہیں
میدان نقشِ پا کے پھولوں سے محروم
میرا مرد، میرے اندر کا مرد، سب سے نچلی سیڑھی پر کھڑا
(جس کا کوئی لمحہ کسی لمحے کے لیے نہیں رکتا)
یادوں کی سنگلاخ زمین پر اپنی ہڈیاں گھسیٹ رہا ہے
یادیں مٹی ہوتی چلی جا رہی ہیں
اس کا نالہ، اس کی رگوں کے پیچوں کے اندر سوکھتا جا رہا ہے
اپنی خاموش فریادوں کے "لشکاروں" سے
وہ اپنی التجاؤں کے نگینے میں الماس جڑ رہا ہے
ـــ اے گرد اڑانے والو ـــ ناچنے والو ـــ!
کٹھن راستے پر پاؤں پٹخنے والو ـــ!

شعرهای دریائی

سکوت ، دسته گل بود
میان حنجرهٔ من

ترانهٔ ساحل ،
نسیم بوسهٔ من بود و پلک باز تو بود.

بر آب ها پرندهٔ باد ،
میان لالهٔ صدها صدا پریشان بود.
بر آب ها ،
پرنده ، بی طاقت بود.

صدای تندر خمش ،
و نور ، نور تر آذرخش ،
در آب ، آینه ای ساخت
که قاب روشنی از شعله های دریا داشت.

نسیم بوسه و
پلک تو و
پرندهٔ باد ،

شدند آتش و دود

میان حجرۂ من ،

سکوت ، دستہ گلی بود -

سمندر کی نظمیں

میرے حلق کے اندر

سکوت ، دستہ ٔ گل

ساحل کا ترالہ

میرے بوسوں کی نسیم اور تیری کھلی ہوئی پلکیں

پانیوں کے اوپر ہوا کا پرندہ

صداؤں کے سینکڑوں آشیانوں کے درمیان منڈلاتا ہوا -

پانیوں کے اوپر پرندے کی بے بسی

بجلی کی بھیگی ہوئی کڑک

اور کوندے کی نم آلود لپک نے

پانی کے اندر آئینہ بنا دیا تھا

اور سمندر کے چنگارے

اس کا چمکتا ہوا چوکھٹا بن گئے تھے

ہوسوں کی نسیم اور

تیری پلکیں اور

ہوا کا پرندہ

سب آگ اور دھواں بن کر رہ گئے ۔

اور میرے حلق کے اندر

سکوت ، دستۂ گل ۔

دلتنگی ها

وقتی که باد می آمد ،

آواز شن ،

درهای بسته را دربانی می کرد

دربهشت بستهٔ درها ، شن ،

پهلو گرفت

و ما ،

از نان و روزنامه سخن کردیم

تنهائی قدیمی دنیا ،

در حرکت ریه هامان ،

در سینه ها تنفس می شد

زندانیان شن ،

وقتی که باد می آمد

از نان و روزنامه سخن کردند .

چه تابناک بود طعام ما !

آداسیاں

جب ہوا چلتی
ریت کی آواز
بند دروازوں کی دربانی کرتی

بند دروازوں کے پیچھے ریت
آ کر لیٹ جاتی
اور ہم
روٹی اور اخباروں کی باتیں کرتے

دنیا کی ازلی تنہائی
ہمارے پھیپھڑوں کے اتار چڑھاؤ میں،
سینوں کے اندر، سانس بن جاتی
ریت کے قیدی
جب ہوا چلتی
روٹی اور اخباروں کی باتیں کرتے

کیا شاندار تھا ہمارا کھانا!

پائیز سبز

زمین فصاحت برگ چنار را
به باد خستهٔ پائیز می سپرد
هوا ترنم سودائی شگفتن را
ز لبض بی طپش خاک می گرفت

غروب ، حرف خودش را
به گوش جنگل خاموش گفته بود
و شیروانی لال ،
میان دودهٔ انشان شب شبج می شد ـ

میان درهم هذیان من دو شعلهٔ سبز
نشست ـ
به روی شیشهٔ تار
ملال پرده شکست
و از حقیقت اشیاء بوی شک برخاست
و با حقیقت اشیاء بوی او پیوست

تمام پنجرهٔ من ،
خیال او شده بود ـ

تمام پوستم از عطر آشتی بیدار،
تمام ذهن من از نور و نسترن سرشار۔
در اوج خود کبوتر
ترتیب پلہ ھا را باور نمی کند۔

و دختران آبی،
وقتی کہ آسمان را می بالند
او درمیان بال و ھوا خود را
ول می کند میان ھوا و بال

سبز خزاں

زمین نے چنار کے پتوں کی فصاحت
خزاں کی تھکی ہوئی ہوا کو سونپ دی
اور فضا شادابی کے جنون کا ترنم
مٹی کی ٹھنڈی نبض سے اخذ کرنے لگی۔

ڈوبتے سورج نے اپنی بات
خاموش جنگل کے کان میں کہہ دی
اور لوہے کی گونگی تکونی چھت
رات کے بکھرتے ہوئے کاجل کے اندر
ہیولا بن گئی۔

میرے ہذیان کی برہمی کے اندر دو سبز شعلے
آ کر بیٹھ گئے -
تاریک شیشوں کے اوپر
پردے کا ملال ٹوٹ گیا
اور اشیا کی حقیقت سے شک کی بو اٹھنے لگی
اور اس کی خوشبو اشیا کی حقیقت کے ساتھ مل گئی -

میرا تمام دریچہ
اس کا خیال بن گیا
میری تمام جلد ، ملاپ کی خوشبو سے لڈھال
اور میرا تمام ذہن ، نور اور نسترن سے سرشار

میں نے اس کی سبز نگاہوں کی نمی میں سے دیکھا
کہ میرے دل کا کبوتر
اس کی آنکھوں کی انتہا میں
بے انتہا کھلے محیط پر حکم ران تھا
اور اونچی چھتوں کا دہکتا ہوا اشیاق
اس کی اڑان کی دوری کے باعث
دھوپ میں جل رہا تھا -

میرے دریچے کے سامنے سے
اس کے خیال نے پر مارے
اور رات بہتی چلی گئی
اور میں بہتا چلا گیا

اشکم را...

دیر میآئی تو ای مسافر اعماق!
بی توام از انتظار خسته و خاموش.
با نمی از خشکسار لوت درونم

نرم بر آئی به چشم، آرام آرام
تا بر گیرم ز شوق، تا ببرد باز
باغ نگاه من از دیار تو پیغام

دیر میآئی تو ای مسافر اعماق!
بی تو خیال من از تو دامن دامن
تا به ستوه آیم از عذاب تانی،
دیر میآئی تو ای رطوبتِ روشن!

روشنی! ای قطرهٔ جدا شده از روح،
ای تنها پاسخ! ای تسلا، ای شور،
حفره ای از قعر جامد من تاریک،
باز شدت باز، تا رها شدی از گور!

تا به ظهور تو، باز پیش نگاهم،
نقش دگرگون جاده هام بلرزد

تا قربانی کنی به پردهٔ چشمم ،
— ای اشک ، ای پیک نور ! —
تاریکیهام را

اینک چشمی که استغاثه اش آورد
چهرهٔ بی علت هزار ستاره !
اینک ، اندیشه ای که پیشکش آورد
تجرید پاک و پر بهای تنم را ،
اشکم را۔

زخم مرا کیست می فرستد درمان ؟

اپنے آنسو سے ۰۰

تو ہمیشہ دیر سے آتا ہے ، اے گہرائیوں کے مسافر!
تیرے بغیر میں انتظار کے مارے تھک گیا ہوں
خاموش ہوگیا ہوں ۔

میرے سینے کے خشک صحرا سے نم لیے ہوئے
تو آہستہ آہستہ میری آنکھوں میں اتر رہا ہے
تا کہ مجھے شوق کے پر لگ جائیں ، تا کہ میرے دل کا باغ
پھر تیرے شہر کا پیغام لا سکے

تو ہمیشہ دیر سے آتا ہے ، اے گہرائیوں کے مسافر!
تیری وجہ سے ، تیرے بغیر ، میرا خیال دامن دامن
پھیلا ہوا ہے
تاکہ اس تاخیر کے عذاب سے اکتا جاؤں
تو ہمیشہ دیر سے آتا ہے ، اے جگمگاتے ہوئے قطرے
اے روشنی کی کرن ، اے میری روح سے بچھڑے ہوئے قطرے
اے تنہا جواب ، اے تسلی ، اے نمکین قطرے !
میرے تاریک ساکن دل کی تہ میں کوئی سوراخ
تیرے لیے کھل گیا اور تجھے اپنی قبر سے نجات مل گئی -

تاکہ تیرے ظاہر ہونے پر ایک بار پھر
میری نگاہوں کے سامنے
راستوں کے نئے نئے نقوش لرزنے لگیں
تاکہ تو میری آنکھوں کے پردوں کے اندر
—اے آنسو ، اے نور کے قاصد !
میری تاریکیوں کو بھینٹ چڑھا دے !

یہ دیکھو ، وہ آنکھ جس کی التجاؤں سے
ہزاروں ستاروں کے بے مقصد چہرے اجاگر ہو گئے

یہ دیکھو ، وہ سوچ

جس نے میرے جسم کی پاک اور سب سے قیمتی تجرید

کی پیشکش کی

میرے آنسو کی ۔

کون ہے جو میرے زخموں کے لیے مرہم

بھیج رہا ہے ؟

فروغ فرخ زاد

(۱۹۳۳ - ۱۹۶۶ء)

پیدائش تہران میں ہوئی اور یہیں کار کے ایک حادثے میں انتقال کر گئیں ۔ بچپن بحیرۂ خزر کے کنارے نوشہر میں بسر ہوا ۔ ابتدائی تعلیم تہران کے مختلف مدارس میں حاصل کی ۔ بچپن میں خیاطی اور نقاشی کی تعلیم پائی ۔ نقاشی کا شوق شاعری کے ساتھ ساتھ عمر بھر رہا ۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں شادی کی ، جو ناکام ثابت ہوئی ۔ تیرہ چودہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا ۔ چار مجموعے اس ترتیب سے زندگی ہی میں شائع ہوئے : ''اسیر'' ، ''دیوار'' ، ''عصیان'' اور ''تولدے دیگر'' ۔ یورپ کے تین سفر کیے ۔ انگلستان میں فلم سازی کی تعلیم حاصل کی اور ایران واپس آکر ڈاکومنٹری فلم تیار کیے ، جن میں خود بھی پارٹ کیا ۔ یورپ کے قیام کے دوران میں اطالوی ، جرمن اور انگریزی زبانیں سیکھیں ۔ فرانسیسی بھی حسبِ ضرورت بول لیتی تھیں ۔ ۱۹۶۵ء میں یونسکو نے اور ایک اطالوی فلم کار برناردو برنو لوچی نے فروغ کی زندگی کے بارے میں پندرہ پندرہ منٹ کے فلم تیار کیے ۔ تہران کے نواحی میں ظہیرالدولہ کے قبرستان میں دفن ہیں ۔ اس مجموعے کے لیے نظمیں ''تولدے دیگر'' سے انتخاب کی گئی ہیں ۔

تولدی دیگر

همهٔ هستی من آیهٔ تاریکیست
که ترا در خود تکرار کنان
به سحرگاه شکفتن ها و رستن های ابدی خواهد برد
من در این آیه ترا آه کشیدم ، آه
من در این آیه ترا
به درخت و آب و آتش پیوند زدم

زندگی شاید
یک خیابان درازست که هر روز زنی با زنبیلی از آن میگذرد
زندگی شاید
ریسمانیست که مردی با آن خود را از شاخه میآویزد
زندگی شاید طفلیست که از مدرسه بر میگردد

زندگی شاید افروختن سیگاری باشد ، در فاصلهٔ رخوتناک دو هماغوشی
یا عبور گنگ رهگذری باشد
که کلاه از سر برمیدارد
و به یک رهگذر دیگر بالبخندی بی معنی میگوید "صبح بخیر"

زندگی شاید آن لحظهٔ مسدودیست
که نگاه من ، در نی نی چشمان تو خود را ویران میسازد
و در این حسی است

که من آنرا با ادراک ماه و با دریافت ظلمت خواهم آمیخت
در اتاق که باندازهٔ یک تنهائیست
دل من
که به اندازهٔ یک عشقست
به بهانه های سادهٔ خوشبختی خود مینگرد
به زوال زیبای گل ها در گلدان
به نهالی که تو در باغچهٔ خانه مان کاشته ای
و به آواز قناری ها
که به اندازهٔ یک پنجره میخوانند

آه ــ !
سهم من اینست
سهم من اینست
سهم من،
آسمانیست که آویختن پرده ای آنرا از من میگیرد
سهم من پائین رفتن از یک پلهٔ متروکست
و به چیزی در پوسیدگی و غربت واصل گشتن
سهم من گردش حزن آلودی در باغ خاطره هاست
و در اندوه صدائی جان دادن که به من میگوید:
"دستهایت را"
"دوست میدارم"

دستهایم را در باغچه میکارم
سبز خواهم شد ، میدانم ، میدانم ، میدانم
و پرستوها در گودی انگشتان جوهریم
تخم خواهند گذاشت
گوشواری به دو گوشم میآویزم
از دو گیلاس سرخ همزاد
و به ناخن هایم برگ گل کوکب میچسبانم
کوچه ای هست که درآنجا
پسرانی که به من عاشق بودند ، هنوز
باهمان موهای درهم و گردن های باریک و پاهای لاغر
به تبسم های معصوم دخترکی میاندیشند که یکشب او را
باد ما خود برد

کوچه ای هست که قلب من آنرا
از محله های کودکیم دزدیده ست

سفر حجمی در خط زمان
و به حجمی خط خشک زمان را آبستن کردن
حجمی از تصویری آگاه
که زمهمانی یک آینه برمیگردد

و بدینسانست
که کسی میمیرد
و کسی میماند

هیچ صیادی در جوی حقیری که به گودالی میریزد، مرواریدی
صید نخواهد کرد۔

من
پری کوچک غمگینی را
میشناسم که در اقیانوسی مسکن دارد
و دلش را در یک نی لبک چوبین
مینوازد آرام، آرام
پری کوچک غمگینی
که شب از یک بوسه میمیرد
و سحرگاه از یک بوسه به دنیا خواهد آمد

دوسرا جنم

میری تمام ہستی تاریکی کی تمثیل ہے
جو تجھے اپنے اندر دہراتی ہوئی
ابدی شادابیوں اور تازگیوں کی صبحوں کی طرف لے جائے گی
اس تمثیل کے اندر میں تیرے لیے آہیں بھرتی رہی، آہ!
میں نے اس تمثیل کے اندر تجھے
درختوں اور پالیوں اور آگ کے ساتھ پیوند کردیا۔

زندگی، شاید
ایک لمبی سڑک ہے جس پر ہر روز کوئی عورت ٹوکری
اٹھائے گذر جاتی ہے

زندگی ، شاید

ایک رسّی ہے جس کے ساتھ کوئی شخص ٹہنی سے لٹک جاتا

ہے

زندگی ، شاید کوئی بچہ ہے جو مدرسے سے گھر لوٹ آیا ہو ۔

زندگی ، شاید دو ہم آغوشیوں کے درمیان سست فاصلوں کے اندر

سگرٹ سلگانا

ہے

یا کسی راہرو کا گھبرائے ہوئے سڑک پار کرنا

راہرو جو اپنی ٹوپی اٹھا کر ، بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ

کسی دوسرے راہرو سے کہہ اٹھتا ہے : "صبح بخیر"

زندگی ، شاید وہ بند لمحہ ہے

جس میں میری نگاہیں تیری آنکھوں کی پتلیوں کے اندر

خود کو برباد کر رہی ہیں ۔

اور اس کے اندر ایک احساس ہے

جسے میں چاند کے ادراک اور ظلمت کے شعور کے ساتھ ملا

دوں گی ۔

ایک کمرے کے اندر ، جو ایک تنہائی کے برابر ہے

میرا دل ،

جو ایک عشق کے برابر ہے

اپنی خوش بختی کے سادہ بہانے ڈھونڈتا ہے

گلدان میں پھولوں کے خوبصورت زوال میں ،

اُس پودے میں جو تُو نے ہمارے گھر کے باغیچے میں لگایا
تھا
اُن پرندوں کی آواز میں
جو ایک دریچہ بھر گیت گا رہے ہیں۔

آہ — !
میرا نصیب یہی ہے
میرا نصیب یہی ہے
میرا نصیب
وہ آسمان ہے جو ایک ہی پردہ لٹکانے سے مجھ سے چھن جائے گا
میرا نصیب! ایک سُونے زینے سے نیچے اترنا ہے
اور کسی چیز سے اُس کی بوسیدگی اور بے کسی میں جا ملنا
میرا نصیب یادوں کے باغ میں ایک غم زدہ سیر ہے
اور کسی آواز کے حزن میں جان دینا جو مجھ سے کہہ رہی ہو
"تیرے ہاتھ
کتنے پیارے ہیں!"
میں اپنے ہاتھوں کو باغیچے میں بو دونگی
میں ہری ہو جاؤں گی، جانتی ہوں، جانتی ہوں، جانتی ہوں!
اور ابابیلیں میری رنگین انگلیوں کے گڑھوں میں
بیج ڈال جائیں گی۔

دو مُرغ سُرخ چیریوں کے جوڑے سے

بالیاں بنا کر میں اپنے دو کانوں میں ڈال لوں گی
اور اپنے ناخنوں پر گلِ کوکب کی پتیاں چپکا لوں گی
اب بھی وہ گلی موجود ہے ، جس میں اب بھی
وہ نوجوان جو مجھ پر عاشق ہوا کرتے تھے
انھی بکھرے بالوں ، نازک گردنوں اور پتلی ٹانگوں کے ساتھ
اس ننھی لڑکی کی معصوم مسکراہٹیں یاد کرتے ہیں
جسے ایک رات ہوا اڑا کر لے گئی ۔

اب بھی وہ گلی موجود ہے جسے میرا دل
میرے بچپن کے محلوں سے چرا لایا تھا ۔

سفر زمانے کے راستے میں گویا ایک وجود ہے
اور کسی وجود کے ذریعے وقت کی سوکھی ہوئی راہ کو حاملہ کرنا ہے
وہ وجود جو ایک ایسی تصویر سے آگاہ ہو
جو ایک آئینے کی دعوت سے لوٹ کر آ رہی ہو ۔
یونہی ہوتا ہے
کہ کوئی مر جاتا ہے
اور کوئی رہ جاتا ہے

کوئی شکاری اس پایاب ندی سے جو کسی گڑھے میں
غائب ہو جاتی ہو ، مروارید شکار نہیں کر سکے گا ۔
میں ایک ننھی غم زدہ پری کو جانتی ہوں

جس کا گھر کسی بڑے سمندر میں ہے
اور اپنے دل کو کسی بنسری پر گاتی رہتی ہے
آہستہ آہستہ
وہ ننھی غم زدہ پری
جو رات کو ایک ہی بوسے سے مر جائے گی
اور صبح ہوتے ہی ایک بوسے سے جی اٹھے گی۔

وهم سبز

تمام روز در آئینه گریه میکردم
بهار پنجره ام را
به وهم سبز درختان سپرده بود
تنم به پیلهٔ تنهائیم نمی گنجید
و بوی تاج کاغذیم
فضای آن قلمرو بی آفتاب را
آلوده کرده بود

نمی توانستم ، دیگر نمی توانستم
صدای کوچه ، صدای پرنده ها
صدای گمشدن توپ های ماهوتی
و هایهوی گریزان کودکان
و رقص بادکنک ها
که چون حباب های کف صابون
در انتهای ساقه ای از نخ صعود میکردند
و باد ، باد که گوئی
در عمق گودترین لحظه های تیرهٔ همخوابگی نفس میزد
حصار قلعهٔ خاموش اعتماد مرا

فشار میدادند
و از شکافهای کهنه ، دامم را بنام میخواندند
تمام روز نگاه من
به چشمهای زندگیم خیره گشته بود
به آن دو چشم مضطرب ترسان
که از نگاه ثابت من میگریختند
و چون دروغگویان
به انزوای بی خطر پلکها پناه می‌آوردند

کدام قله کدام اوج ؟
مگر تمامی این راههای پیچا پیچ
در آن دهان سرد مکنده
به نقطهٔ تلاقی و پایان نمیرسند ؟
به من چه دادید ، ای واژه های ساده فریب
و ای ریاضت اندامها و خواهش ها ؟
اگر گلی به گیسوی خود میزدم
ازاین تقلب ، از این تاج کاغذین
که بر فراز سرم بو گرفته است ، فریبنده تر نبود ؟

چگونه روح بیابان مرا گرفت
و سحر ماه ز ایمان گله دورم کرد !
چگونه ناتمامی قلبم بزرگ شد

و هیچ نیمه ای این نیمه را تمام نکرد!
چگونه ایستادم و دیدم
زمین به زیر دوپایم ز تکیه گاه تهی میشود
و گرمی تن جفتم
به انتظار پوچ تنم ره نمیبرد!
کدام قله کدام اوج ؟
مرا پناه دهید ای چراغ های مشوش
ای خانه های روشن شکاک
که جامه های شسته در آغوش دود های معطر
بربامهای آفتابیتان تاب میخورند
مرا پناه دهید ای زنان ساده کامل
که از ورای پوست، سرانگشت های نازکتان
مسیر جنبش کیف آور جنینی را
دنبال میکند
و در شکاف گریبانتان همیشه هوا
به بوی شیر تازه می آمیزد
کدام قله کدام اوج ؟
مرا پناه دهید ای اجاقهای پر آتش، ای نعل های خوشبختی -
و ای سرود ظرفهای مسین در سیاهکاری مطبخ
و ای ترنم دلگیر چرخ خیاطی
و ای جدال روز و شب فرشها و جاروها

مرا پناه دهید ای تمام عشق های حریصی
که میل دردناک بقا بستر تصرفتان را
به آب جادو
و قطره های خون تازه میآراید

تمام روز تمام روز
رها شده ، رها شده ، چون لاشه ای بر آب
به سوی سهمناک ترین صخره پیش میرفتم
به سوی ژرف ترین غارهای دریائی
و گوشتخوار ترین ماهیان
و مهره های نازک پشتم
از حس مرگ تیر کشیدند

نمی توانستم دیگر نمی توانستم
صدای پایم از انکار راه بر میخاست
و یأسم از صبوری روحم وسیعتر شده بود
و آن بهار ، و آن وهم سبز رنگ
که بر دریچه گذر داشت ، با دلم میگفت
«نگاه کن
تو هیچگاه پیش نرفتی
تو فرو رفتی»

سبز وہم

میں تمام دن آئینے کے اندر روتی رہی
بہار نے میرے دریچے کو
درختوں کے سبز وہم کے ہاتھوں سونپ دیا تھا
میرا بدن میری تنہائی کے خول کے اندر نہیں سما سکتا تھا
اور میرے کاغذی تاج کی بو نے
اس دھوپ سے محروم سرزمین کی فضا کو آلودہ کر دیا تھا ۔

میں بے بس تھی ، اب میں بے اس تھی
گلی کی آوازیں ، پرندوں کی چہکار
اون کی گیندوں کے گم ہو جانے کا شور و غل
اور بچوں کی بھاگتی ہوئی چیخ پکار
اور غباروں کا ناچ
غبارے جو صابن کے جھاگ سے بنے ہوئے بلبلوں کے مانند
دھاگے کی کونپلوں کے آخری سرے سے اوپر چڑھ رہے تھے
اور ہوا ــــ ہوا ، یوں کہو
ہم آغوشی کے تاریک لمحوں کی گہرائی میں ہانپ رہی تھی
میرے اعتماد کے سنسان قلعے کی دیواروں کو کوئی دبا رہا تھا
اور پرانے شگافوں میں سے میرے دل کو نام لے لے کر
پکارا جا رہا تھا ۔

تمام دن میری نگاہیں

اپنی زندگی کی آنکھوں پر جمی رہی تھیں
اُن دو بے قرار ڈری ہوئی آنکھوں پر
جو میری ٹھہری ہوئی نظروں سے
جھوٹوں کے مانند کتراتی
اور پلکوں کے محفوظ کونوں میں پناہ ڈھونڈتی تھیں۔

کیسی چوٹی، کیسی بلندی؟
کیا یہ سبھی پُر پیچ راہیں
اُس ایک ٹھنڈے، سب کو چوس لینے والے منہ کے اندر، ایک ہی سنگھم پر
جا کر نہیں مل جاتیں؟ ختم نہیں ہو جاتیں؟
میں نے آخر تم سے کیا پایا، اے سادہ دلوں کو فریب دینے والے لفظو!
اے بدنوں کی ریاضتو، اور اے دل کی خواہشو؟
اگر میں اپنے بالوں میں کوئی پھول ٹانک لیتی
تو کیا وہ اُس جھل سے اُس کاغذی تاج سے
جو میرے سر پر پڑا پڑا سڑ گیا ہے، زیادہ دلفریب نہ ہوتا؟

کیسے بیابان کی روح نے مجھے اُچک لیا
اور چاند کی کشش نے مجھے رپوڑ کے ایمان سے الگ کر دیا
کیسے میرے دل کا ادھورا پن بڑھتا چلا گیا
اور کسی آدھے نے اِس آدھے کو پورا نہ کیا

کیسے میں کھڑی دیکھتی رہ گئی
کہ زمین میرے دو پاؤں کے نیچے اپنے سہاروں سے محروم ہوتی جا رہی ہے
اور میرے ساتھی کے جسم کی گرمی
میرے جسم کے بے معنی انتظار تک چل کر نہیں پہنچتی -

کیسی چوٹی ، کیسی بلندی ؟
مجھے پناہ دو ، اے دھندلے چراغو !
اے دُبدھے میں پڑے ہوئے اُجلے گھرو !
جن کی دھوپ میں چمکتی ہوئی چھتوں پر
دھلے ہوئے کپڑے خوشبودار دھوؤں کی گود میں لہرا رہے ہیں -

مجھے پناہ دو ، اے سادہ اور مکمل عورتو !
جن کی نازک انگلیوں کے مورے جلد کے اوپر سے
اپنے نازائیدہ بچوں کی مست کر دینے والی جنبش کو
ٹٹولتے رہتے ہیں
اور جن کے گریبانوں کے چاک میں ہوا
ہمیشہ تازہ دودھ کی خوشبو سے ملی ہوتی ہے -

کیسی چوٹی ، کیسی بلندی ؟
مجھے پناہ دو ، اے آگ سے بھرے ہوئے چولھو !
کہ تم خوش بختی کے لعل ہو —
مجھے پناہ دو ، اے باورچی خانوں کے دھوئیں سے کجلائے ہوئے

تالیے کے برتنو!
اے سلائی کی مشینوں کے دلگیر نغمو!
اور اے قالینوں اور جھاڑوؤں کی دن رات کی لڑائیو!
مجھے پناہ دو، اے تمام جوشیلی چاہتو!
کہ بقا کی دردناک خواہش جن کے بسترِ زفاف کو
جادو کے پانی
اور تازہ خون کے قطروں سے آراستہ کرتی رہتی ہے۔
تمام دن، تمام دن
پانی کے اوپر بہتی ہوئی تنہا تنہا لاش کے مانند
میں کسی خوفناک ترین چٹان کی طرف بہتی رہی
سمندر کے تمام گہرے غاروں کی طرف
اور سفاک ترین مچھلیوں کی طرف بہتی رہی
اور میری کمر کے نازک مُہروں کے اندر
موت کے خیال سے ٹیسیں اٹھتی رہیں

میں بے بس تھی
اب میں بے بس تھی
میرے پاؤں کی چاپ راستے کے انکار سے بلند ہو رہی تھی
اور میری نومیدی میری جان کے حوصلے سے کہیں بڑھ گئی تھی
اور وہ بہار، وہ سبز رنگ وہم

جو میرے دریچے کے سامنے سے گذرا کرتا تھا
میرے دل سے کہہ رہا تھا: "دیکھ
تُو ذرّہ بھر آگے نہیں بڑھ سکی
بلکہ نیچے ہی نیچے اترتی چلی گئی ہے۔"

آیه های زمینی

آنگاه

خورشید سرد شد
و برکت از زمین ها رفت

و سبزه ها به صحراها خشکیدند
و ماهیان به دریا ها خشکیدند
و خاک مردگانش را
زان پس به خود نپذیرفت

شب در تمام پنجره های پریده رنگ
مانند یک تصور مشکوک
پیوسته در تراکم و طغیان بود
و راهها ادامهٔ خود را
در تیرگی رها کردند

دیگر کسی به عشق نیندیشید
دیگر کسی به فتح نیندیشید
و هیچکس
دیگر به هیچ چیز نیندیشید

در غار های تنهائی
بیهودگی به دنیا آمد
خون بوی بنگ و افیون میداد
زنهای باردار
نوزادهای بی سر زائیدند
و گاهواره ها از شرم
به گورها پناه آوردند

چه روزگار تلخ و سیاهی
نان ، نیروی شگفت رسالت را
مغلوب کرده بود
پیغمبران گرسنه و مفلوک
از وعده گاههای الهی گریختند
و بره های گمشده
دیگر صدای هی هی چوپانی را
در بهت دشتها نشنیدند

در دیدگان آینه ها گوئی
حرکات و رنگها و تصاویر
وارونه منعکس میگشت
و برفراز سر دلقکان پست
و چهرهٔ وقیح فواحش

یک هالهٔ مقدس نورانی
مانند چتر مشتعلی میسوخت
سرداب های الکل
با آن بخار های گس مسموم
انبوه بی تحرک روشنفکران را
به ژرفنای خویش کشیدند
و موشهای موذی
اوراق زرنگار کتب را
در گنجه های کهنه جویدند

خورشید مرده بود
خورشید مرده بود ، و فردا
در ذهن کودکان
مفهوم گنگ گمشده ای داشت

آنها غرابت این لفظ کهنه را
در مشق های خود
با لکهٔ درشت سیاهی
تصویر مینمودند

مردم ،
گروه ساقط مردم

دلمرده و لکیده و مبهوت
در زیر بار شوم جسدهاشان
از غربتی به غربت دیگر میرفتند
ومیل دردناک جنایت
در دستهایشان متورم میشد
گاهی جرقه ای ، جرقهٔ ناچیزی
این اجتماع ساکتِ بیجان را
یکباره از درون متلاشی میکرد
آنها به هم هجوم میآوردند
مردان گلوی یکدیگر را
با کارد میدریدند
و درمیان بستری از خون
با دختران نابالغ
همخوابه میشدند

آنها غریقِ وحشت خود بودند
و حس ترسناک گنهکاری
ارواح کور و کودنشان را
مفلوج کرده بود

پیوسته در مراسم اعدام
وقتی طناب دار

چشمان پُر تسنج محکومی را
از کاسه بافشار به بیرون میریخت
آنها به خود فرو میرفتند
و از تصور شهوتناک
اعصاب پیر و خسته شان تیر میکشند
اما همیشه در حواشی میدان ها
این جانیان کوچک را میدیدی
که ایستاده اند
وخیره گشته اند
به ریزش مداوم فواره های آب

شاید هنوز هم
در پشت چشم های له شده ، در عمق انجماد
یک چیز نیم زندهٔ مغشوش
بر جای مانده بود
که در تلاش بی رمقش میخواست
ایمان بیاورد به پاکی آواز آبها

شاید ، ولی چه خالی بی پایانی
خورشید مرده بود
و هیچکس نمیدانست
که نام آن کبوتر غمگین
کز قلبها گریخته ، ایمانست

آہ ! ای صدای زندانی
آیا شکوہ یأس تو ہرگز
از ہیچ سوی این شب منفور
نقبی بسوی نور نخواہد زد ؟
آہ ، ای صدای زندانی !
ای آخرین صدای صداہا . . . !

زمین کی نشانیاں

اس وقت
سورج ٹھنڈا پڑ گیا
اور زمینوں سے برکت اٹھ گئی

اور سبزے صحراؤں میں سوکھ گئے
اور مچھلیاں سمندروں میں سوکھ گئی
اور مٹی نے اس کے بعد اپنے مردوں کو
قبول کرنے سے انکار کر دیا

رات ، تمام بے رنگ کھڑکیوں میں
کسی مبہم تصور کے مانند
متواتر ٹھاٹھیں مارتی ، اور سیلاب کے مانند چڑھتی رہی
اور راستوں نے اپنا بہاؤ
اندھیرے میں ترک کر دیا

اب کوئی شخص عشق کو یاد نہیں کرتا تھا
اب کوئی شخص فتح مندیوں کو یاد نہیں کرتا تھا
اور کوئی شخص
کسی چیز کو یاد نہیں کرتا تھا

تنہائی کے غاروں میں
بیہودگی نے جنم لیا
لہو سے بھنگ اور افیون کی لہک آنے لگی
حاملہ عورتیں سر کٹے بچے جننے لگیں
اور گہوارے شرم کے مارے
قبروں میں سر چھپانے لگے۔

کیسا تلخ اور تاریک زمانہ
روٹی نے رسالت کی حیرت انگیز قوت کو مغلوب کر دیا تھا
بھوکے اور بد حال پیغمبر
لقائے ربانی کے مقامات سے بھاگ کھڑے ہوئے
اور بھٹکی ہوئی بھیڑیں
اب گڈریوں کی ''ہش ہش'' کو
مرغزاروں کے تحیّر کے اندر نہیں سن پاتی تھیں

یوں لگتا تھا آئینوں کی آنکھوں میں
حرکات کے رنگوں اور تصویروں کے عکس الٹے پڑنے لگے تھے،
اور رذیل مسخروں کے سروں کے اوپر

اور ناحشاؤں کے بے حیا چہروں کے اوپر
ایک مقدس نورانی ہالہ
ایک دہکتے ہوئے چھالے کے مانند بھڑک رہا تھا۔

شراب کی دلدلیں
جن سے تند زہریلے بخارات اٹھ رہے تھے
روشن فکر لوگوں کے بے حس و حرکت ہجوم کو
اپنی گہرائیوں کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھیں
اور موذی چوہے
کتابوں کے سنہری اوراق کو
پرانی الماریوں کے اندر کترتے جا رہے تھے

سورج مر چکا تھا
سورج مر چکا تھا — اور آنے والا دن
بچوں کے ذہنوں میں
ایک گونگا، بھولا بسرا مطلب بن کر رہ گیا تھا
اس متروک لفظ کے انوکھے پن کی تصویریں
وہ اپنی مشق کی کتابوں میں
سیاہی کے بھدے دھبوں کے ذریعے
کھینچتے رہ گئے تھے۔

لوگ،
لوگوں کا ایک ذلیل گروہ،

مردہ دل اور مبہوت گروہ،
اپنے ہی مردہ جسموں کے منحوس بوجھ تلے دبا ہوا
ایک پردیس سے دوسرے پردیس کی طرف بڑھ رہا تھا
اور گناہ کی دردناک خواہش
اُن کے ہاتھوں کے اندر ورم پیدا کرنے لگی تھی

کاہے کوئی چنگاری، کوئی چھوٹی سی چنگاری
اس خاموش بے جان اجتماعی کے سینوں کو
یک دم اندر سے چاک کر ڈالتی
تو یہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے
مرد، ایک دوسرے کا گلا
چھریوں سے کاٹنے لگتے
اور لہو سے تر بستروں پر
نابالغ لڑکیوں کے ساتھ سو جاتے

یہ اپنی ہی وحشت میں ڈوبے ہوئے لوگ تھے
اور گناہ گاری کے مہیب احساس نے
اُن کی اندھی اور بے وقوف روحوں کو
مفلوج کر دیا تھا

ہمیشہ سزائے موت کی تقریب پر
جس وقت پھندے والے کے ہاتھوں

کسی مجرم کی اینٹھی ہوئی آنکھیں
اپنے کٹوروں کے اندر ابل پڑتیں
تو یہ لوگ اپنے اندر ڈوب جاتے
اور شہوت انگیز تصورات سے
ان کے بوڑھے اور تھکے ہوئے اعصاب میں
ٹیسیں اٹھنے لگتیں

لیکن یہ آئندہ کے حقیر مجرم ، ہمیشہ
میدانوں کے کنارے کھڑے دکھائی دیتے
اور پانی کے فواروں کے پیہم بہاؤ سے
ان کی آنکھیں چندھیائی رہتیں

شاید اب بھی ان کی پامال آنکھوں کے پیچھے
ان کے جمود کی گہرائیوں میں
ایک نیم زندہ مبہم سی چیز باقی رہ گئی ہے
جو اپنی کمزور سی جستجو میں
پانیوں کے گیت کی پاکیزگی پر ایمان لانا چاہتی ہے
شاید ، لیکن یہ کیسا بے پایاں خلا تھا
سورج مر چکا تھا
اور کوئی نہیں جانتا تھا
کہ اس غم زدہ کبوتر کا نام
جو دلوں سے اڑ چکا ہے
ایمان تھا

آہ ! اے قید کی ہوئی صدا !
کیا تیری نومیدی کا شکوہ کبھی
اس مکروہ رات کی کسی سمت سے
نقب لگا کر روشنی تک نہیں پہنچ سکتا ؟
آہ ! اے قید کی ہوئی صدا !
اے صداؤں میں آخری صدا — !

دریافت

در حباب کوچک
روشنائی خود را میفرسود
تا کجهان پنجره پر شد از شب
شب سرشار از انبوه صداهای تهی
شب مسموم از هرم زهر آلود تنفس ها
شب . . .
گوش دادم

در خیابان وحشت زدهٔ تاریک
یک نفر کوئی قلبش را
مثل حجمی فاسد
زیر پا له کرد
در خیابان وحشت زدهٔ تاریک
یک ستاره ترکید
گوش دادم . . .

نبضم از طغیان خون متورم بود
و تنم . . .

تنم از وسوسه‌ی
متلاشی گشتن ـ
روی خط های کج و معوج سقف
چشم خود را دیدم
چون رطیلی سنگین
خشک میشد در کف ، در زردی ، در خفقان

داشتم با همه جنبش هایم
مثل آبی را که
ته نشین میشدم آرام آرام
داشتم
لرد میبستم در گودالم

گوش دادم
گوش دادم به همه زندگیم
موش منفوری در حفرهٔ خود
یک سرود زشت مهمل را
با وقاحت میخواند
جیر جیری سمج و نامفهوم
لحظه ای فانی را چرخ زنان میپیمود
و روان میشد برسطح فراموشی

آہ! من پُر بودم از شہوت ۔ شہوت مرگ
ہر دو پستانم از احساسی سرسام آور تیر کشید

آہ!

من بہ یاد آوردم
اولین روز بلوغم را
کہ ہمہ اندامم
باز میشد در بہتی معصوم
تا بیامیزد باآن مبہم ، آن گنگ ، آن ناملعوم

در حباب کوچک
روشنائی خود را
در خطی لرزان خمیازہ کشید ۔

انکشاف

روشنی ننھے سے بابلے کے اندر
اپنے آپ کو گھس گھس کر ختم کرتی رہی
اچانک کھڑکی رات سے بھر گئی
کھو کھلی صداؤں کے ہجوم سے مست رات ،
رات ، سانسوں کی زہریلی بُو سے زہر آلود رات
رات —

میں کان لگا کر سننے لگی
سہمے ہوئے، اندھیرے بازار میں
جانو، کسی شخص نے اپنے دل کو
کسی سڑے ہوئے جسم کے مانند
پاؤں تلے مسل ڈالا تھا
سہمے ہوئے اندھیرے بازار میں
کوئی ستارہ پھوٹ گیا تھا
میں سنتی رہی—

لہو کی طغیانی سے میری نبضیں پھول رہی تھیں
اور میرا بدن—
میرا بدن، پارہ پارہ ہو جانے کے وہم سے—
چھت کی آڑی ترچھی لکیروں کے اوپر
میں نے اپنی آنکھ کو دیکھا
کہ کسی بڑے مارے مکڑے کے مانند
وہ اپنے ہی جھاگ میں، اپنی زردی اور اپنے خفقان میں
سوکھتی جا رہی تھی
میں کروٹ پر کروٹ لے رہی تھی
اور ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح
آہستہ آہستہ تہہ میں بیٹھتی جا رہی تھی
آپ اپنے گڑھے کے اندر، میں

اپنی تلچھٹ بنتی جا رہی تھی
میں کان لگا کر سننے لگی
اپنی پوری زندگی کو سننے لگی
ایک مکروہ چوہا اپنے بل کے اندر
پوری بے حیائی کے ساتھ ، ایک بھدا سا ، مہمل سا گیت الاپ رہا تھا
ایک مسلسل ، گھناؤنی ، بے معنی آواز
چکر کھاتی ہوئی ، ایک مٹ جانے والے لمحے کو پار کر رہی تھی
اور فراموشی کی سطح کی جانب رواں تھی ۔

آہ ، میں تمنا سے لبریز تھی — موت کی تمنا سے
میرے دونوں پستانوں میں ایک سرسام پیدا کرنے والے احساس سے
ٹیسیں اٹھ رہی تھیں ۔

آہ ! مجھے اپنے بلوغ کا پہلا دن یاد آنے لگا
جب میرا سارا بدن
ایک معصوم تحیر میں
کھل جانے کو تھا
تا کہ اس مبہم ، اس خاموش ، اس نامعلوم
کے ساتھ واصل ہو جائے ۔

روشنی نے
ننھے بلبلے کے اندر
ایک تھرتھراتی ہوئی لکیر بن کر
جانی لی ۔

تنهائی ماه

در تمام طول تاریکی
سیر سیرکها فریاد زدند:
«ماه، ای ماه بزرگ. . . !»

در تمام طول تاریکی
شاخه ها با آن دستان دراز
که از آنها آهی شهوتناک
سوی بالا میرفت

و نسیم تسلیم
به فرامین خدایانی نشناخته و مرموز
و هزاران نفس پنهان، در زندگی مخفی خاک
و در آن دایرهٔ سیار نورانی، شبتاب
دقدقه در سقف چوبین
لیلی در پرده
غوکها در مرداب
همه باهم، همه باهم یکریز
تا سپیده دم فریاد زدند:
«ماه، ای ماه بزرگ. . . !»

در تمام طول تاریکی
ماه در مهتابی شعله کشید
ماه
در تنهای شب خود بود
داشت در بغض طلائی رنگش میتر کید

چاند کی تنہائی

رات بھر ، تمام لمبی رات
جھینگر فریاد کرتے رہے :
"چاند ، اے عظیم چاند—!"

رات بھر ، تمام لمبی رات
لمبے لمبے بازوؤں والی شاخیں
جن سے آرزو بھری آہیں اٹھ رہی تھیں
اور نسیم ، انجانے پر اسرار خداؤں کے فرمانوں پر سر جھکائے
خاک کی پوشیدہ ہستی کے اندر
ہزاروں چھپی ہوئی سانسیں
جگنو اپنے گھومتے ہوئے دائرۂ نور میں
لکڑی کی چھت کے اندر ہیجان
لیلی اپنے محمل میں
اور مینڈک دلدلوں میں
سب مل کر سب لگاتار فریاد کرتے رہے :

"چاند، اے عظیم چاند — !

رات بھر، تمام لمبی رات
چاند شہ نشین پر شعلے برساتا رہا
چاند
اپنی رات کا تنہا دل
جیسے اپنے ہی سنہرے غم میں پھوٹ پھوٹ کر
رو دینے کو ہو۔

محمود کیانوش

مشہد میں ۱۹۳۴ء میں متولّد ہوئے اور وہیں کے مدارس میں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔ پھر تہران آ کر دانش سرائے مقدماتی (جونیئر ٹریننگ کالج) سے ڈپلوما حاصل کیا اور معلمی کے پیشے میں مصروف ہو گئے۔ چند سال بعد ، تہران یونیورسٹی سے انگریزی زبان اور ادب میں بی ۔ اے کرنے کے بعد وزارتِ اقتصاد میں ملازمت اختیار کی اور اب بھی وہیں ملازم ہیں ۔ ہائی اسکول کے زمانے میں شعر کہنا شروع کیا اور مختصر افسانے بھی شائع کیے ۔ نظموں کے یہ پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں : "شبستان" ، "سادہ و غمناک" ، "شکوفۂ حیرت" ، "باویز" اور "ماہ و ماہی در چشمۂ باد" ۔ ایک ناول "مردِ گرفتار" اور مختصر افسانوں کے دو مجموعے "قصہ ای و قصہ ای" اور "در آنجا ہیچ کس نبود" بھی اُن کے قلم سے ہیں ۔ کہانیوں کا ایک مجموعہ "آئینہ ھای سیاہ" زیرِ اشاعت ہے۔انگریزی سے سیموئیل بیکٹ اور یوجین اونیل کی بعض تصانیف کا ترجمہ بھی کیا ہے ۔ زیر نظر مجموعے کے لیے نظمیں "ماہ و ماہی در چشمۂ باد" سے لی گئی ہیں ۔

گفتم سرود

گفتم : سرود ،

هزاران گل کبود

در چشم من نشست ،

پرواز ارغوانی ابر کبوتران

بر آسمان شکست .

از مزرع طراوت دریا

خون سرکشید و شاخه برآورد و برگ داد ،

بطن شکوفه های بلورش

از نطفهٔ طلوع تمام ستارگان

شوری گرفت و در تپش افتاد و داغ شد ،

و آنگاه خاک بایر زرگون کهکشان

یکپاره باغ شد .

دیدم در آبگینهٔ چشم شکستگان

سیای ناشناخته‌ای را ،

در دست چپ شراب ،

عشق ،

خوشۂ گندم ،

در دست راست خنجر مسموم آختهای را ۔

ای وای ، این دوگانہ یک چهره کیست ؟

من !

جان خدا و دیو

در محبس یگانۂ یک تن ؟

بگذار تا شکست شعبدۂ نور ،

تا عقد با شکوه ظلمت و خاموشی صبور ،

این خون دیر مالدۂ آلودگان خاک

در قدس آب موج بگیرد ،

فریاد "وای ، وای ، چہ باید کرد ؟"

تا برترین ستارۂ نادیده اوج بگیرد ۔

میں نے کہا گیت

میں نے کہا گیت ،

ہزاروں نیلے نیلے پھول

میری آنکھوں میں آ کر جم گئے

اور آسمان پر کبوتروں کے بادلوں کی ارغوانی پرواز

پھیل گئی ۔

سمندر کی تازگی کے کھیتوں میں
لہو اُگ آیا ، اُس کی شاخیں نکل آئیں ، پتے نکل آئے
اُس کی بلوریں گلیوں کے بطن میں
تمام ستاروں کے طلوع کے نطفے سے
آسنک اٹھی ، اُس میں دھڑکن پیدا ہوئی اور وہ گرما گئی
اور اُس وقت کہکشاں کی سنہری بنجر زمین
اچانک باغ بن گئی۔

مجھے شکستہ حالوں کی آنکھوں کے آبگینوں میں
ایک انجانا چہرہ دکھائی دیا
بائیں ہاتھ میں شراب ،
عشق ،
گیہوں کی بالیاں ،
دائیں ہاتھ میں ایک زہر میں بجھا ہوا بے نیام خنجر

ہائے یہ ایک ہی چہرے کے دو رخ — یہ کون ہے ؟

میں !
خدا کی جان بھی اور شیطان بھی
ایک ہی جسم کے اکہرے زندان میں ؟

نُور کے اِس طلسم کے ٹوٹنے تک
اِس صابر خاموشی اور تاریکی کے شاندار میل تک

خاک میں لتھڑے ہوؤں کے پرانے لہو کو
پانی کی تقدیس کے اندر لہریں اٹھانے دو
اور "ہائے ہائے ، اب کیا کریں ؟" کی پکار کو
کسی ان دیکھے سب سے اونچے ستارے کی
بلندیوں تک پہنچ جانے دو ۔

انسان شقایق نیست

ابر آرامی دارد در دامن باد
باد پروازی دارد بر گلشن آب
آب را در بر می‌گیرد شعلهٔ خاک
خاک را مستی می بخشد بادهٔ نور

ماه و ماهی در چشمهٔ باد
شور خارا در سینهٔ آب
برف و شبنم در آئینهٔ خاک
چنگ تاریکی در طرهٔ نور

باد
آزاد
آب
بیتاب
خاک
چالاک
نور
مغرور -

آسمانها شاد از نشأت بال
آبها سرشار از شوق نزاع
خاکها خرم از سحر هوا
بطن جنگلها گرم از شور شکار.

ما شقایقها را می بینیم
ما شقایقها را دامن دامن می چینیم
گرچه گاهی پنهانند از چشم
زود بر می‌گردند
بالبانی خندان از بی خبری
با همان سرخی، زیبائی، افراشتگی
با همان بازی‌ها در فسق نسیم
با همان عشرتها در محفل ابر
با همان آمیزشها در بستر نور -

ما شقایقها را می بینیم
ما شقایقها را دامن دامن می چینیم
تا به زیبائیشان آرایش بدهیم
حجله هامان را گاهی
گورهامان را گاه دگر -

ما شقایقها را می بینیم
با شکفتاری جادوئی در پهنهٔ خاک
ما به آنها با نفرت می نگریم ؛
غمزشان با ما در حیرت ما
اعتناشان با خود در رویش خود
ریشه هاشان در اشک
در تبسم
در تشنجها و تپش ها
در غزلها و مرثیه ها۔

ما شقایقها را باشادی دامن دامن می چینیم
ما شقایقها را با نفرت می نگریم
شادمانیهان از نا آگاهی ، گاهی
نفرت از این آگاهی که هنوز :

ابر آرامی دارد در دامن باد
باد پروازی دارد بر گلشن آب
آب را در بر می گیرد شعلهٔ خاک
خاک را مستی می بخشد بادهٔ نور۔

انسان لالۂ صحرائی نہیں

بادل ہوا کے دامن میں چین پاتے ہیں
ہوا پانی کے باغوں کے اوپر اڑتی رہتی ہے

پانی کو خاک کے شعلے اپنے آغوش میں لیے رہتے ہیں
خاک کو نور کی شراب مستی بخشتی ہے

ماہ و ماہی ہوا کے چشموں کے اندر
پتھروں کا شور پانی کے سینے ہیں
برف اور شبنم خاک کے آئینے کے اندر
اندھیرے کے پنجے نور کی زلفوں میں

ہوا
آزاد
پانی
بے تاب
خاک
چالاک
نور
مغرور

آسمان پرواز کے نشے سے دل شاد
پانی تگ و دو کے ذوق میں سرشار
خاک کے تودے ہوا کے جادو سے خوش
جنگلوں کا بطن شکار کی آرزو سے گرم۔

ہم لالۂ صحرائی کو دیکھتے ہیں
ہم لالۂ صحرائی کے پھولوں کو دامن دامن چنتے ہیں

اگرچہ گاہے وہ ہماری آنکھوں سے چھپے ہوتے ہیں
لیکن جلد ہی لوٹ بھی آتے ہیں
بے خبری سے مسکراتے ہوئے
وہی سرخی ، وہی دلکشی ، وہی شادابی لیے
نسیم کی عشوہ گری سے چھل کرتے ہوئے
بادلوں کی محفلوں میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے
نور کے بستروں پر بدستور ہم آغوشی کرتے ہوئے۔

ہم لالۂ صحرائی کو دیکھتے ہیں
ہم لالۂ صحرائی کے پھولوں کو دامن دامن چنتے ہیں
تاکہ گاہے اپنے حجلوں کو
ان کی دلکشی سے رونق بخشیں
گاہے اپنی قبروں کو روشن کریں ۔

ہم لالۂ صحرائی کو دیکھتے ہیں
جب اس کے پھول اپنا افسوں لیے
خاک کی پہنائی میں کھل اٹھتے ہیں
ہم انھیں نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں
وہ ہماری حیرت کے وقت ہم سے عشوہ گری کرتے ہیں
ان کا دھیان صرف اپنی ہی روئیدگی کی طرف رہتا ہے
ان کی جڑیں اپنے آنسوؤں میں ،
اپنی مسکراہٹوں میں ،

اپنی ہی کشمکش میں ، اپنی ہی دھڑکنوں میں ،
غزلوں میں اور مرثیوں میں ۔

ہم لالۂ صحرائی کے پھولوں کو ہنسی خوشی دامن دامن چنتے ہیں
ہم لالۂ صحرائی کو نفرت سے دیکھتے ہیں
ہماری مسرت گاہے ہماری بے خبری کے باعث ہوتی ہے
اور ہماری نفرت گاہے اس آگاہی کے باعث کہ ابھی

بادل ہوا کے دامن میں چھپ جاتے ہیں
ہوا پانی کے باغوں کے اوپر اڑتی ہے
پانی کو خاک کے شعلے اپنے آغوش میں لیے رہتے ہیں
خاک کو نور کی شراب مستی بخشتی ہے ۔

کدام درد ؟

چه تار و ساکت و جادو گرفته لیم شبی بود !
ترا شکسته دیدم و تنها ، تنها
نهال بید بودی ،
نازک ،
لرزان ،
ولی نه خشم زمستان ،
نه تازیانهٔ باد ـ
لبم به پرسشی آشفته شد ،
تو با تبسم تلخ
مرا گداختی از شرم و بی زبان گفتی :
«من از خرابی ساغر نمی شوم آباد»
به خانه رفتم و یاد تو بر دلم آویخت
ز خواب دیده نهفتم ،
به خویشتن گفتم :
«بیا

بیا و درد برادر را

به طعم خون ،

به عطر تشنج ـ

به رنگ تنهائی ،

در ساغر سرود بریز"

شبم گذشت و سحر نقش بید لرزان را
ز باغ پنجره برد
و من که از همهٔ درد ها گسیخته بودم
هنوز درد ترا از سبوی دل

به ساغر پاک سرود

لریخته بودم ـ

و باز نیم شبی
ترا میان جنگل ناراستان
دیدم
که بر بلندی اصرار
به چار میخ بودی و آنان
به روی روشن تو سنگپارهٔ دشنام
نثار می کردند ،
و خون پاک تو از چشمه های خنجر و میخ
به روی خاک

گناه سکه پرستان را
می شست ؛
و روسپیان ،
دزدان -
تهیدستان ،
—نهفته از وقاحت آنان—
به پای دار
گرید های زار
می کردند -

لبم به پرسشی آشفته شد ،
تو با تبسم مهر
مرا به اوج کشاندی و بی زبان گفتی :
(من از شقاوت نامردمانمی رنجم -)
به خانه رفتم و ماندم بیدار
تا که لاله صبح
شکفت
ولی هنوز ،
هنوز در کجاوهٔ دل
شهید درد ترا
به شهر های مقدس ،

به قبله گاههای سرود

می بردم ـ

ولی چه سود

نه کافور وزن ،

نه خلعت تشبیه و استعاره ،

نه تابوت قافیه ای ـ

و باز لیم شبی و هزار لیم شبی
ترا و درد های ترا دهدم و به خود گفتم :
"توای شکسته ،

ای خستهٔ دلبسته :

ای شاعر ،

بیا ،

بگو که سرانجام

از کدام درد برادر

سرود خواهی ساخت ؟

کدام درد ؟"

کون سا درد ؟

کیسی تاریک ، پُر سکوت اور سحر زدہ تھی ، آدھی رات
میں نے تجھے نڈھال پایا اور تنہا تنہا
کو بید کا درخت تھا ،

نازک ،

لرزتا ہوا ،

لیکن نہ کہیں جاڑے کا غضب تھا

نہ ہوا کا تازیانہ —

میرے ہونٹ ایک سوال سے گھبرا اٹھے

اور تو نے ایک کڑوی مسکراہٹ کے ساتھ

مجھے ندامت میں پگھلا دیا اور کچھ کہے بغیر کہا :

”دل کے سونے پن کا دارو پیرِ مغاں کے پاس نہیں“

میں گھر پہنچا اور تیری یاد میرے دل سے لپٹ گئی

لپند سے میں نے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں

اور اپنے آپ سے کہا :

”آ ،

آ ، اور اپنے بھائی کے دُکھ کو

لہو کے ذائقے کے ساتھ

ذہنی کشاکش کی خوشبو کے ساتھ

اور تنہائی کے رنگ کے ساتھ

ملا ، اور گیت کے پیالے میں انڈیل ۔“

میری رات گذر گئی ، اور صبح نے کانپتے ہوئے بید کی تصویر کو

دریچے کے باغ سے محو کر دیا

اور میں جو تمام دُکھوں سے جان بچا کر بھاگ نکلا تھا
میں ابھی تک تیرے دکھ کو اپنے دل کے سبو سے
گیت کے پاکیزہ پیالے میں
نہیں انڈیل سکا تھا۔

اور پھر آدھی رات، میں نے
تجھے غلط کاروں کے جنگل میں
دیکھا
جب تو اپنے اصرار کی بلندی سے
سُولی پر لٹک رہا تھا، اور وہ
تیرے نورانی چہرے پر گالیوں کے پتھر
برسا رہے تھے۔
اور تیرا پاک خون خنجروں اور میخوں کے چشموں سے
زمین پر سکہ پرستوں کے گناہ دھو رہا تھا

اور رالدی ہوئی عورتیں،
چور،
بھک منگے
—ان غلط کاروں کی بے حیائی سے پوشیدہ—
سُولی کے نیچے زار زار رو رہے تھے۔
میرے ہونٹ ایک سوال سے گھبرا اٹھے،
تُو ایک محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ

مجھے بلندیوں پر اٹھا لے گیا اور تو نے کچھ کہے بغیر کہا :
"مجھ کو ایسے سنگداوں سے کوئی رنج و یاس نہیں"

میں گھر پہنچا اور مجھے نیند نہیں آئی
حتیٰ کہ صبح کا لالہ کھل اٹھا

لیکن ابھی تک میں
اپنے دل کے محمل میں
تیرے دکھ کے شہید کو
مقدس شہروں کی طرف ،
گیتوں کی قبلہ گاہوں کی جانب
اٹھائے لیے جا رہا تھا ۔

لیکن کیا حاصل ؟
نہ میرے پاس وزن کا کافور
نہ تشبیہ اور استعارے کے کفن
نہ قافیوں کے تابوت ---

اور پھر آدھی رات اور ہزاروں آدھی راتوں
میں نے تجھے اور تیرے دکھوں کو دیکھا اور اپنے آپ سے
کہا :
"اے نڈھال ،

اے تھکے ہارے ،

اے دلگیر شاعر !

آ ،

اور بتا ، تو آخرِ کار

بھائی کے کون سے دکھ ، کون سے درد سے

گیت تیار کرے گا

کون سے درد سے ؟"

رضا براهنی

پیدائش ۱۹۳۵ء میں تبریز میں ہوئی اور وہیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم مکمل کی ۔ تبریز یونیورسٹی سے انگریزی زبان اور ادبیات میں ڈگری حاصل کی ۔ پھر ترکی جا کر استنبول یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ پاس کی ۔ ترکی سے واپس آ کر تہران یونیورسٹی میں انگریزی ادب پڑھانے پر مامور ہوئے ۔ اب تک وہیں بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کی جماعتوں کو جدید انگریزی ادب ، ناول اور تنقید پڑھاتے ہیں ۔ ان کی نظموں کے مجموعوں کا نام ہے : "آھوان باغ" ، "جنگل و شعر" (ایک طویل نظم) اور "شبی از نیمروز" ۔ تین اور دیوان زیرِ طبع ہیں ۔ "مصیبت سلسلۂ گل" ، خطابۂ این خطہ" اور "تذکرۂ تغزل" ۔ نظموں کا ایک انتخاب اور تین لمبی نظموں کا ایک مجموعہ "سہ منظومہ" بھی جلد شائع ہونے والے ہیں ۔ تنقید کی دو کتابیں : "طلا در مس" اور "در شعر و شاعری" اور ناول کی تکنیک کے بارے میں ایک کتاب "قصہ نویسی" شائع ہو چکی ہے ۔ متفرق تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "نقدِ تحلیلی" زیرِ اشاعت ہے ۔ اس کے علاوہ ایرانی کلچر پر ایک کتاب اور متفرق مضامین کا ایک مجموعہ اشاعت کے لیے

تیار ہے۔ شیکسپئر کے ڈراموں اور بعض یورپی زبانوں کے ناولوں کے ترجمے بھی اُن کے قلم سے ہیں۔ ایک عرصے تک رسالہ "جہانِ نو" کے مدیرِ اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ اور گذشتہ پانچ چھ برس سے اُن کے تنقیدی مضامین بیشتر رسالہ "فردوسی" میں چھپتے رہتے ہیں۔ آج کل ایک طویل ناول "روزگارِ دوزخیِ آقای ایاز" لکھنے میں مصروف ہیں۔ زیر نظر مجموعے کے لیے نظمیں خود مصنف سے حاصل کی گئی ہیں۔ یہ اُن کے زیر اشاعت مجموعوں میں شامل ہوں گی۔

تغزلی حماسی

در آئینه های جوان منعکس گشته دوشیزگیهای یک جنگل جاودانی
تو در خواب گسترده من نشسته ، در آئینه های
به من گوش کن گر تو آنی که از آینه‌ها شنیدن توانی

نشسته تو در بارگاه فلق می توانی
برویانی از شانه های بلند آفتابی
تو باز آمدن نیز ، حتی ، توانی

شبی خواب دیدم ، نسیم از شمال شب گیسوانت و زیدن گرفته مست
نفس می کشد باغ با شاخه هایش به سوی جهان جنوبی
و ماهی که تبعیدی عصرها بود ، سوی جهان باز گشته مست
درختان ، پری های رقصان بُغند و هادند
صدائی نمی آمد اول ، ولی ، بعد دیدم :
تو انگشت باریک خود را گرفتی به سوی درختان
شکفتند گلها همه ناگهانی
و آن بلبل شعرهای کهن ، از کنا گا، چهچهی زد ، گوارا تر از
آب جو بار آئینه سانی

و لبهای آنگاه
به اطراف ما ساختند از صداها ، سراتی
چو بیدار گشتم ، هنوز از نوازش تنم شعله‌ور بود
به زیرلبم این دعا غوطه‌ور بود :
تو باز آمدن نیز ، حتی توانی ، اگر این همه می‌توانی

از این شهر تا شهر دیگر ، مناره مناره ، همه مشرق عارفان است
یگانه یگانه ، تمام درختان ـ سرود بزرگ مجسم ـ همه ایستاده
و خورشید می تابد از پشت دیوارهاشان
سپاهان روشن نشان گیاهان ، همه نیزه افراشته در برابر
و عرفان پاک حماسی ـ خلود سپیده
و اشراق خورشید از اندیشه هامان ـ
تو چون جنگلی وحشی و استوائی
وزیدی بسوی تناور ترین آفتابی که میسوخت شب ، روز
می سوخت
و آنگاه من مرکز فصلها گشتم ، آغاز گشتم
مرا جنگلی از عسل غرق کرد و فرو برد
من از شانه های تو آغاز کردم
که شانه سراسر نشانه ز اشراق خورشید از پشت کوه است
که شانه سراسر شکوه است
من از دست آغاز کردم که سر تا سرش دوستانه ست
چو باز آمدم از میان جلال دوبازوی آئینه سانت ،

من از پا و از سجده کردن ، من از خلسه آغاز کردم که خود
منتهای خلوص است

در آن لحظه های شکفتن شنیدم که با خویش گفتم :
تو باز آمدن نیز ، حتی توانی ، اگر این همه می توانی

گرامی ترین واژه های تو یک شب شنیدم که گفتند :
شکفته ست روی شکن در شکن گیسوالت
گل اندر گل آنجا ، مثال بلوغ بهاری
اگر آن درختان قامت کشیده به افلاک ، چون موجهای دعا
پاک
توانند گلهائی از اوج ریزند روی علف های نرم بهاری
تو باری بسان درختان ، فروتن شدن می توانی
تو باز آمدن نیز ، حتی توانی ، اگر این همه می توانی

اگر دیدگان تو رفتند از معبر عصمت دیدگانم
رهاگشته از دیدگالت ، هنوز آن نگاه مجرد ، خیابان خیابان مرا
می کشاند

اگر یاد ناب نگاه مجرد ، چو امواج آبی به دریاچه های ضمیرم
چو پرواز فوج هزاران پرنده ، به ظهر بلند خیالم نباشد
اگر یاد ناب نگاه مجرّد ، چو مهری مقدس ، همه قبله گاهم نباشد
بیابان بیابان کشانم ، تنم را ، جنازه جنازه ، به سوی پناهی ،
پناهی که پایان آن نیست جز ناتوانائی بی پناهی

ولی آن سراب مقدس کہ آن سوی ہول بیابان نشستہ ست
بمن گفت روزی کہ تو می توانی
تو باز آمدن ، گر فروتن شوی ، می توانی

گرفتم سراسر جہان را کہ قہر است ، بیماری و ناتوانی
گرفتم کہ آفاق تسخیر گردیدہ با آہنین ابرہائی
تو آیا نہ آئی کہ باز آمدن می توانی ؟ نہ آئی ؟

ایک رجزیہ غزل

جوان آئینوں میں ایک جاودانی جنگل کی دوشیزگیاں
منعکس ہو رہی تھیں
تو میرے پھیلے ہوئے خواب میں آئینوں کے اندر
بیٹھی ہوئی تھی
اگر تو وہی ہے جو آئینوں کی باتیں سن سکتی ہے
تو میری بات بھی سن !

تو صبح کی بارگاہ میں بیٹھی ہوئی
اپنے بلند شانوں سے آفتاب اگا سکتی ہے
تو پھر تو لوٹ کر بھی آ ہی سکتی ہے

میں نے ایک رات خواب دیکھا کہ تیرے گیسوؤں کی رات
کے شمال سے
نسیم چلنے لگی ہے
باغ اپنی ٹہنیوں کے ذریعے جنوبی دنیاؤں کی طرف
سانس لے رہا ہے
اور چاند ، وہ زمانوں کا جلا وطن
دنیا کی جانب لوٹ آیا ہے
درخت باغ میں ناچتی ہوئی پریاں ہیں ، شاد و مسرور ۔
پہلے پہل کوئی صدا نہیں آتی ، پھر میں دیکھتا ہوں
تو نے اپنی نازک انگلی درختوں کی جانب اٹھا دی
اور تمام پھول اچانک کِھل پڑے
اور پرانی شاعری کا بلبل کسی پھول کے گوشے سے
چہچہا اٹھا
اس کا چہچہہ آئینوں کے مانند چمکتی ہوئی ندیوں کے پانی سے بھی
زیادہ خوشگوار تھا
اور اس وقت ہونٹوں نے ہمارے چاروں طرف
صداؤں کا گھر کھڑا کر دیا
جب میں جاگا تو ابھی پیار سے
میرا بدن پھڑک رہا تھا
اور زیرِ لب یہ دعا غوطے لگا رہی تھی
"اگر تو یہ سب کچھ کر سکتی ہے ، تو لوٹ کر بھی آ ہی
سکتی ہے"

اس شہر سے کسی اور شہر تک ، مینار سے مینار تک

ہر طرف عارفوں کا مشرق پھیلا ہوا ہے

اور تمام درخت جو مجسّم سرود ہیں ، ایک عظیم سرود

بے مثال کھوڑے ہیں

اور اُن کی دیوار کے پیچھے سورج چمک رہا ہے

ہودوں کے چمکیلے نشانوں والے لشکروں نے اُن کے برابر نیزے اٹھائے ہوئے ہیں

اور ہمارے خیالوں سے رجز کا ایک پاکیزہ عرفان ،

اجالے کی ابدیت ، اور سورج کا طلوع بلند ہو رہا ہے

تو کرم خطوں کے ایک وحشی جنگل کے مانند

ایک بے حد طاقتور سورج کی جانب لہراتی ہوئی چلی

وہ جنگل جو راتوں کو جلتا تھا

دنوں کو سلگتا تھا

اور اس وقت میں موسموں کا مرکز بن گیا اور میری ابتدا ہو گئی

مجھے شہد کے کسی جنگل نے ڈبو لیا اور بہا کر لے گیا

تیرے شانوں سے میری ابتدا ہو گئی

کہ شانہ ، سراسر پہاڑوں کے پیچھے سے سورج کے طلوع کی علامت ہے

کہ شانہ ، سراسر شکوہ کی علامت ہے

میری ابتدا ہاتھوں سے ہوئی ، وہ ہاتھ جو سرتاسر دوستی کے
ہاتھ ہیں

جب میں دو آئینوں کے مانند چمکتے ہوئے بازوؤں کے جلال
کے درمیان لوٹا

میری ابتدا پاؤں سے ،

سجدوں سے ، ہستی سے ہوئی
جو آپ پاکیزگی کا منتہا ہے

شگفتگی کے ان لمحوں میں مَیں نے سنا کہ خود سے کہہ رہا ہوں
" اگر تو یہ سب کچھ کر سکتی ہے ، تو لوٹ کر بھی آ ہی
سکتی ہے "

مَیں نے ایک رات تیرے نہایت بیش بہا الفاظ سنے ، جو کہہ
رہے تھے :
تیرے شکن در شکن گیسوؤں کے اوپر
بہار کے بلوغ کے مانند پھول ہی پھول کِھل رہے ہیں
اگر یہ درخت جنھوں نے پاک دعاؤں کی موجوں کے مانند
اپنا قد آسمانوں تک اٹھا رکھا ہے
بہار کی نرم نرم گھاس پر بلندی سے پھول برسا سکتے ہیں
تو تُو بھی درختوں کے مانند کبھی جھک سکتی ہے
اور تُو اگر یہ سب کچھ کر سکتی ہے ، تو لوٹ کر بھی
آ ہی سکتی ہے

ایک بار تیری آنکھیں میری آنکھوں کی پاکیزگی کے پُل پر
سے گذر گئیں

تو وہ مجرّد نگاہ جو تیری آنکھوں سے جدا ہوئی تھی، آج تک
مجھے راستوں پر کھینچے لیے جا رہی ہے

اگر اس مجرّد نگاہ کی پاکیزہ یاد میرے ضمیر کی جھیل کی
لہروں کے مانند،

ہزاروں پرندوں کے لشکر کی پرواز کے مانند، میرے خیال کی
اونچی دوپہر
پر طاری نہ ہو

اگر اس مجرّد نگاہ کی پاکیزہ یاد کسی مقدس مُہر[1] کے مانند
میری تنہا قبلہ گاہ نہ ہو،

تو میں اپنے جسم کے جنازے بیابان بیابان اٹھائے پھروں،
کسی پناہ کی تلاش میں

ایسی پناہ کی تلاش میں، جس کا پایان بے پناہی کی ناتوانی
کے سوا کچھ نہ ہو

لیکن وہ مقدس سراب جو بیابان کے ہَول کے اُس پار جا گزین ہے
ایک دن مجھ سے کہنے لگا:

۱۔ مدینے یا کربلا کی خاک سے بنی ہوئی مہر جس پر شیعہ حضرات نماز
میں سجدہ کرتے ہیں۔

کہ تو ایک دن لوٹ کر آ سکتی ہے ، اگر تو جھک جائے تو
لوٹ کر آ سکتی ہے

مانا یہ دنیا سراسر قہر ہے ، بیماری اور ناتوانی ہے
مانا کہ لوہے کے بادلوں نے آفاق پر قبضہ جما رکھا ہے
تو آیا تو وہ نہیں جو لوٹ کر آ سکے؟ کیا تو وہ نہیں ؟
کیا تو وہ نہیں —؟

محمد حقوقی

۱۹۳۶ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کی ۔ اعلیٰ تعلیم تہران یونیورسٹی کے دانش سرائے عالی (ٹیچرز ٹریننگ کالج) میں پائی ۔ سوائے ان چند برسوں کے ہمیشہ اصفہان میں زندگی بسر کی ہے اور آج کل بھی وہیں مقیم ہیں ۔ نظموں کے دو مجموعے "زوایا و مدارات" اور "فصل ہائے زمستانی" شائع ہو چکے ہیں ۔ ایک اور مجموعہ "شرق ها" اور ایک تنقید کی کتاب "شعرِ دیروز و شعرِ امروز" کئی جلدوں میں زیرِ ترتیب ہے ۔ اصفہان میں معلم ہیں اور ساتھ ہی بعض دوستوں کے ساتھ مل کر ایک پیش قدم (آوان گارد) سہ ماہی رسالے "جُنگ" (بیاض) کی ادارت کرتے ہیں ۔ زیر نظر مجموعے کے لیے نظمیں "فصل ہائے زمستانی" سے منتخب کی گئی ہیں ۔

در سایهٔ سراب

تاریخ در برابر آئینه ایستاد
و باد ،
باد تیرهٔ شرق
در مثنوی به خط موازی وزید و رفت ـ

گاهی که مولوی
ارواح را به بام تماشای شب نشست
(مارا ـ شبانیان)
آیا سپیده ، سایهٔ او بود کز نهایت شب آویخت ؟
آیا سپیده ، سایهٔ او بود ؟

گاهی که روز
از پشت شانه های تو آمد ،
تو آمدی ،
و عشق ، نام یافت ـ

در چشم این شبانی گمنام
در باد های تیرهٔ شرق . . .

آہ ــــ !

(در کوچہ ہای آبی آویزان)

تو . . . ای تو از شبانۂ تاریخ آمدہ !

جسم مرا در آتش تابوتہای سبز

در سایۂ سراب

بر تختی از شراب نشان . . .

تو !

با گریۂ ستارہ و با اضطرار ماہ

وقتی پلنگ خیرۂ مغرور

سمای ماہ را بہ تماشا نشستہ است

و ماہ

با خونی از ستارۂ نورانی ست . . .

سراب کے سائے میں

تاریخ آئینے کے سامنے رک گئی

اور ہوا ،

مشرق کی تاریک ہوا

مثنوی کی متوازی لکیروں میں آئی اور چلی گئی ۔

اگر کبھی رومی

روحوں کا نظارہ کرنے کے لیے رات کی چھت پہ جا بیٹھتا

ہمارا—

(ہم رات والوں کا نظارہ کرنے کے لیے)

تو کیا اُجالا اُسی کا سایہ ہوتا ،

رات کے کسی کونے سے لٹکا ہوا ؟

کیا اُجالا اُسی کا سایہ ہوتا ، اُسی کا ؟

کبھی دن

تیرے کندھوں کے پیچھے سے نکل آتا

تو گویا تو ہی نکل آتا

اور عشق کہلاتا ۔

اُس گمنام رات والے کی آنکھوں میں

ان مشرق کی تاریک ہواؤں میں

آہ — !

(ان نیلی لٹکی ہوئی گلیوں میں)

کو—

اے تاریخ کے سفرِ شب سے آنے والے

میرے جسم کو سبز تابوتوں کی آگ میں

سراب کے سایے میں

شراب کے بنے ہوئے تخت پر بٹھا دے—

کو

جب ستارے رو رہے ہوں ، جب چاند بے قرار ہو
جب مغرور چیتے چاند کے چہرے کو
ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہوں
اور چاند سے نورانی ستاروں کا
لہو ٹپک رہا ہو—

مقصد، شراب خانهٔ شرقی بود

مرگ پرنده بود که بر شانهٔ نسیم گذر داشت

و خانه های خرم در بسته، شیشه پی شده بودند
—"بی اعتنا به شهر فراغت
باید گذشت
بیهوده است خشم تو
بیهوده است".

و سنگهای بادیه را باد برده بود
در عصر های مشغله، در عصرهای کور
ای دوست
آن قرابهٔ نزدیکتر
کجاست ؟ !

و ناگه آن پرندهٔ خونین
از قلب غرفه های چراغانی
و شانهٔ نسیمی من
افتاد

بر برگهای حیرت پائیزی
در فصل سرد مدرسه گشتند

مقصد شرابخانهٔ شرق بود
از جنگل نگاه خیالانی ۔
—" آه — ! ای همیشه سایهٔ بیداری
در سایهٔ همیشهٔ بیدار . . آه !" ۔
وقتی پرنده باده نمی نوشد . . .
وقتی پرنده باده نمی نوشد . . .

و قلب مرد بادیہ
نا گاه
از آسمان میکده آویخت ۔
و از دل شراب شبانی
زنی غریب
به ساعت نگاه کرد ۔

و مرگ ،
درمیانهٔ میخانه
ایستاد

مقصد تھا مشرقی شراب خانہ

وہ کسی پرندے کی موت تھی ، جو نسیم کے کندھوں پر
گذر رہی تھی

اور بند دروازوں والے ہنستے کھیلتے گھر
شیشے کے گھر بن کر رہ گئے تھے۔

"اس کھاتے پیتے شہر سے
بے پروا گذر جائیں۔
تیرا غصہ بے کار ہے
بے کار ہے۔"

اور ریگستان کے پتھروں کو ہوا اڑا لے گئی تھی۔
کام کی شاموں میں، اندھی شاموں میں
اے دوست!
وہ بہت نزدیک رکھی ہوئی صراحی کہاں ہے؟
اور اچانک وہ خون میں لتھڑا ہوا پرندہ
چراغوں کے جھلملاتے ہوئے غرفوں کے سینے سے
میرے نسیم کے مانند ہلکے کندھوں پر
گر پڑا
اور خزاں کی حیرت کے پتے
مدرسوں کے ٹھنڈے موسم میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔
مقصد تھا مشرق عراجغالہ
بازاروں میں پھیلی ہوئی نگاہوں کے جنگل سے
"آہ! اے بیداری کے ابدی سایے

بیداری کے ابدی سائے میں بیدار — آہ!"

اس وقت جب پرندہ شراب نہیں پیتا تھا

جس وقت پرندہ شراب نہیں پیتا تھا۔

اور ریگستان کے رہنے والے آدمی کا دل

اچانک

میخانے کے آسمان سے لٹک آیا تھا

اور رات والے کی شراب کے دل سے

ایک اجنبی عورت نے

گھڑی پر نظر ڈالی۔

اور موت

میخانے کے بیچ میں

کھڑی رہ گئی۔

اسماعیل خوئی

مشہد میں ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم پائی - اس کے بعد تہران آ کر دانش سرائے عالی (ٹیچرز ٹریننگ کالج) سے فلسفہ اور علم تربیت میں ڈگری حاصل کی - بعد میں یونیورسٹی کالج لندن میں داخل ہو کر ایم - فل پاس کیا اور تہران آ کر دانش سرائے عالی میں تاریخِ فلسفہ ، فلسفۂ تعلیم اور روش شناسی (میتھوڈو لوجی) کے استاد مقرر ہوئے اور آج کل وہیں پڑھاتے ہیں - دو مجموعے "بے تاب" (قدیم رنگ میں) اور "بر خنگِ راھوارِ زمین" (نئے رنگ میں) چھپ چکے ہیں اور ایک اور مجموعہ "بر بامِ گردباد" زیر طبع ہے - اس مجموعے کے لیے ایک نظم "برخنگِ راھوارِ زمین" سے لی گئی ہے اور دو زیرِ اشاعت مجموعے سے مصنف نے خود بہم پہنچائی ہیں -

شمال نیز

جنوب شهر را باران ویران خواهد کرد ـ

جنوب شهر را
باران
ویران خواهد کرد. . .

و من — شگفتا ! — غمگین نمی شوم ـ
نگاه کن :
تمام اندوهش را ابر در فضای باران پاشیده ست ـ
و من ، که عاشق اندوه بوده ام ،

نگاه می کنم ، اما
از این تماشا غمگین نمی شوم ـ
نگاه می کنم ، اما
به غیر ابر نمی بینم
که می سراید. . .
اندوهش را ؟ . . .
نه !

سقوط غم را در خود باید جشن بگیرم ـ

نگاه می کنم ، اما
به غیر ابر نمی بینم
که می سراید خشم شبانه‌ٔ خود را ،
و می نوازد در آذرخش ، در رگهای من ،
سرود سرکش بیدار تازیانه‌ٔ خود را ـ
سقوط عاطفه های لطیف را در خود
باید
امشب
جشن بگیرم ـ

من ، این زمان ،
رسا و منفجرم ، مثل خشم ؛
و ، مثل خشم ، توانایم ـ
و می توانم دیوان شعر حافظ را بردارم ،
و برگ برگش را
با دستهای خویش
پاره پاره کنم ؛

و می توانم — چون خنجر و پلاسیدن —
لزوم خون و خزان را باور کنم ؛
و می توانم در رهگذار باد قد افرازم ،
و باغی از شکوفه و شبنم را پرپر کنم ؛

و می توانم حتا

—حتا از نزدیک—

سر بریدنِ یک تا هزار برهٔ نوباوه را نظاره کنم.

من این زمان ،

رسا و منفجرم .

جنوب شهر ویران خواهد شد؛

و جای هیچ غمی نیست .

به ابر ایمان دارم .

اطمینان دارم که ابر می داند ؛

و بذر خود را ، دامن دامن ،

به خیره برسر این قحطسال مردمی نمی افشاند .

جنوب شهر ویران خواهد شد ؛

و جای هیچ غمی نیست ، جای هیچ غمی نیست :

جنوب شهر باید ویران شود .

ستم ؟

نه ، این ستمی نیست !

ستم ترحّم بر گودال هاست ؛

ستم ترحّم بر بوته های دره نشین است .

به قله بودن و بر دره رحمت آوردن :

ستم هماره همین بوده است ،

سیل می گوید ،

من می گویم ،

ستم همواره همین است ـ

وسیل می‌گوید :

ـــ"تمام گودی ها را باید پر کرد ـ

و کوه و دره نباید باشد ـ

تمام سطح زمین را هموار باید کرد ـ

خوشا شکفتن خورشید برگشادگی ی دشت ..."

نگاه کن :

بزرگوار ترین آوار،

خروش و خشم توانای بی امان ،

آنک :

هجوم جنگلی از پیل های مست دمان ؛

و بیم زیر و زبر گشتن

که پنجه می فکند در دلِ زمین و زمان ـ

نگاه کن :

شکوهمند ترین سیل ،

حماسه واری پر شور

که می سراید ، گوئی ، همرائی ی طبیعت و تاریخ را ـ

نگاه کن :
چه خوب می داند ؛
و می تواند ۔

نگاه کن ۔
نگاه کن ۔
که گفته است که ویران شدن تماشائی نیست ؟
که گفته است که ویران شدن غم‌انگیز است ؟
جنوب شهر ویران خواهد شد ؛
و جای هیچ غمی نیست :
جنوب شهر را آوار آب ویران خواهد کرد ؛
شمال شهر را
ویرانی ی جنوب...

شمال بھی

جنوبِ شہر کو بارش ویران کر دے گی

جنوبِ شہر کو بارش ویران کر دے گی
اور میں — عجیب بات ہے ۔
غمگین نہیں ہوں گا ۔
دیکھ

بادل نے اپنا سارا غم بارش کی پہنائی میں چھڑک دیا ہے۔
اور میں کہ غم کا عاشق رہا ہوں
دیکھ رہا ہوں ، لیکن
اس نظارے سے غمگین نہیں ہوں
دیکھ رہا ہوں ، لیکن
بادل کے سوا کچھ نہیں دیکھ پاتا
کون گا رہا ہے ــــــ
اپنا غم ؟ ــــــ
نہیں !

چاہیے کہ آج رات اپنے اندر غم کے نزول کا جشن مناؤں
میں دیکھ رہا ہوں ، لیکن
بادل کے بغیر کچھ نہیں دیکھ پاتا
جو اپنا راتوں کا غصہ گا رہا ہے
اور بجلی کے اندر اور میری رگوں کے اندر
اپنے تازیانوں کا جاگتا ہوا باغی نغمہ بجا رہا ہے۔
اپنے اندر لطیف جذبات کے نزول کا جشن مناؤں
آج رات۔

میں اس وقت
بھرا ہوا ہوں ، پھٹ جانے کو ہوں
غصے کے مانند

غصے کے مانند طاقتور ہوں
میں حافظ کی غزلوں کا دیوان اٹھا کر
اس کا ورق ورق
اپنے ہاتھوں سے
پارہ پارہ کر سکتا ہوں۔
خنجر اور پھولوں کے مرجھانے کے مانند
میں خون اور خزاں کے باہمی ربط کا قائل ہوں
میں ہوا کی راہوں میں سیدھا کھڑا ہو سکتا ہوں
اور کلیوں اور شبنم سے بھرے ہوئے باغوں کو
ہوا میں بکھیر سکتا ہوں۔

یہاں تک کہ
ایک سے لے کر ایک ہزار تک بھیڑ کے بچوں کے سر کٹنے کا نظارہ
نزدیک سے کر سکتا ہوں
میں اس وقت بھرا ہوا ہوں
پھٹ جانے کو ہوں۔

جنوبِ شہر ویران ہو کر رہے گا
اور کچھ غم نہیں۔

بادل پر ایمان رکھتا ہوں
مجھے یقین ہے کہ بادل جانتا ہے

اور اپنے بیج ، دامن دامن
بے کار مردمی کی اس قحط سالی پر نہیں ڈالتا ۔

جنوبِ شہر ویران ہو کر رہے گا
اور کچھ غم نہیں ، بالکل غم نہیں ۔
جنوب شہر کو ویران ہو ہی جانا چاہیے ۔
ظلم ہے ؟

نہیں ، یہ ظلم نہیں
ظلم ، گڑھوں پر ترس کھانا ہے ۔
ظلم ، جنگلی پودوں پر ترس کھانا ہے
ظلم ، چوٹی پر بیٹھ کر وادی سے ہمدردی کرنا ہے
ظلم ہمیشہ سے یہی رہا ہے
سیلاب کہتا ہے
میں کہتا ہوں
ظلم ہمیشہ یہی رہا ہے

اور سیلاب کہتا ہے :
—"تمام گڑھے بھر دیے جائیں
پہاڑ اور درے نہیں چاہئیں
زمین کی پوری سطح کو ہموار کر دینا چاہیے

میدانوں کی پہنائی میں کھلی ہوئی دھوپ

کیسی سہانی ہوتی ہے—"

دیکھ ،

بہت بڑی پھوار

بے پناہ جوش و خروش سے بھری ہوئی

دیکھ ،

مست چنگھاڑتے ہوئے ہاتھیوں کے جنگل

اور ہر چیز کے تہ و بالا ہو جانے کا ڈر

جس نے زمین و زمان کے سینے میں اپنا پنجہ گاڑ دیا ہے

دیکھ ،

کیسا شاندار سیلاب

کسی بہادری کی داستان کے مانند امنگوں سے لبریز

جو فطرت اور تاریخ کی ہم آہنگی کا گیت گاتا ہوا آ رہا ہے

دیکھ ،

کیا خوب سمجھتا ہے

اور کتنی ہمت رکھتا ہے

دیکھ ،

دیکھ ،

کس نے کہا ویران ہونے میں مزا نہیں

کس نے کہا ویران ہونے سے دکھ پہنچتا ہے ؟

جنوبِ شہر ویران ہو کر رہے گا ۔

اور کچھ غم نہیں

جنوبِ شہر کو پانی کا ریلا ویران کر دے گا

اور شمالِ شہر کو

جنوب کی ویرانی —

در امتدادِ زرد خیابان

زرد پوشان به چه می اندیشند ؟

صف به صف
ستوار
استاده به جای ،
چون ستونهایی از پولاد
که بر آنها بامی از باد . . .
به چه می اندیشند این مردان ؟
می تواند بود
آیا
کالسوی دانستن
دردی انداخته باشد چنگ
با دل این بیدردان ؟
— بیدردان ؟
— آری :
اینچنین ، از دور که بینی شان ، پنداری .

در نگاه هر یک
چنبره ی ساکت بی حسی ی پرهولی ست ،
همچنان ماری افسرده ز سرمای زمستانی .

وای ،

وای اگر سر بردارند .

پدرانشان در مزرعه دارند دیانت می‌کارند.

و نگاه هر یک

— فواره ای از حیرت .

بر شده تا دل افلاک —

گوئیا می گوید :

— "ابرها ، این همه ابر ، این همه ابر ، این همه ابر ،

آخر از چیست که امسال نمی بارند ؟ . .

آه ، باید ، به حقیقت باید ،

باید اینان بپذیرند

آن صدا را کزغرش هر رعد به گوش آید :

— "ابرها گاوانند .

شیر شان را می خواهی نوشید ؟

آستین ها را باید بالا بزنی

و پذیرا باشی امکان لگد خوردن را .

ابرها را باید دوشید .

ورنه از اشک پر افروزی اگر صد فانوس

تیرگی های افق را ، در چار جهت ،

همچنان خالی خواهی دید ،

و راکوتر نگری ،
پس هر بارش مصنوعی نیز
خشکسالی خواهی دید . . . "

پدرانشان در مزرعه دارند دیالت می کارند
و برادرهاشان ، در غربت شهر ،
میهمانانی ناخوانده ،
گیج ، گم ، سرگردان ،
رانده ،
وامانده .

و شگفتا ! دردا !
مثل این است که این بیدردان ،
زرد پوشان را می گویم . . .

[اینک آن لحظه که باید گفت .
اینک آن لحظه که باید عریان گفت .
شعر خوب
مثل دهدن عریان است .
آه ! اما من
با حروف سربی پیمانی دارم ؛
و حروف سربی

دیرگاهی ست که از عریانی می ترسند .

باز گویا باید

گفتنم مثل نگفتن باشد .

باز باید در صندوق خیالم را بگشایم

و ببینم در آن

قامت دیدن را ، از ململ بوسیدهٔ تمثیل ،

گردگون پیرهنی آیا هست .

هست :]

. . . زرد پوشان را می گفتم :

مثل این است که این بیدردان

هم از این خاک نروئیدند ،

هم از این آب ننوشیدند ،

و — همانگونه که من —

هر یکی برگی از این باغ نیند .

مرگ خود را ،

باغ

فوج جراری از زرد می آراید .

باورم نیست ، خداوندا !

خواب می بینم پنداری :

بنگر ، آن روح خزان است که با دلدالهای زردش

می خندد و می آید .

لحظه ای سرخ

— که می دانی —

در راه است .

دیر یا زود

خشمی از دوزخ خواهد گفت :

— "آتش !"

گل یاس غمگینی را دیدم

رُسته بر ساقهٔ بیداری ،

نگران در زردان .

— "ها که گویم

(می خواند و سری می جنباند)

که دلم خونین است ،

و که می سوزم ، می سوزم ، می سوزم از این

که چرا چونین است

و چرا چونینند اینان :

این خطرناکترین مسکینان ،

وحشت انگیز ترین فوج لدالستن

و توانستن . . ."

سڑک کی خاکی لمبائی میں

خاکی پوش کیا سوچ رہے ہیں ؟
صف بہ صف
سیدھے
اپنی جگہ پر کھڑے
فولاد کے ستونوں کے مانند
جن کے اوپر چھت ہوا کی ہے ۰۰
کیا سوچ رہے ہیں یہ لوگ ؟
شاید ایسا ہو
کہ آگاہی کے اُس پار
کسی درد نے اِن بے دردوں کے دلوں میں
پنجہ گاڑ رکھا ہو ؟
— بے درد ؟
— ہاں
اور کیا ! دُور ہی سے دیکھ کر آپ سمجھ جائیں گے۔
ہر ایک کی نگاہوں میں
کسی بے حس و حرکت خوفناک چیز نے
کنڈلی مار رکھی ہے
کسی سانپ کی مانند ، جو جاڑوں کی سردی سے مرجھا رہا ہو
افسوس !

افسوس ! اگر یہ کہیں سر اٹھا دیں ۔

ان کے باپ کھیتوں میں سچائی بو رہے ہیں
اور ہر ایک کی نگاہیں
حیرت کے فوارے ہیں
جو آسمان تک اٹھ رہے ہیں
گویا کہہ رہے ہوں :
— "بادل ، یہ سب بادل ، یہ سب بادل
کس لیے اس سال نہیں برسے ؟"

آہ ! انھیں چاہیے ، سچائی کی قسم ، انھیں چاہیے
انھیں چاہیے کہ اس آواز کو قبول کریں
جو ہر بجلی کی دہاڑ کے ساتھ سنائی دیتی ہے ۔

بادل گائیں ہیں ۔
ان کا دودھ پئیں گے آپ ؟
تو آستینیں چڑھا لیجیے
اور اگر لات کھانی پڑے تو تیار رہیے ۔
بادلوں کو دوہنا ضروری ہے ۔
ورنہ اگر آپ آنسوؤں سے سو فانوس ہی کیوں نہ روشن کرلیں
افق کے اندھیرے چاروں طرف
ویسے کے ویسے ہی سنسان رہیں گے ۔
اور اگر آپ غور سے دیکھیں

تو ہر مصنوعی بارش کے پیچھے
آپ کو خشک سالی دکھائی دے گی۔
ان کے باپ کھیتوں میں سچائی او رہے ہیں
اور ان کے بھائی پردیسی شہروں میں
بن بلائے مہمان ہیں
گھبرائے ہوئے، گم سم، پریشان
راندے ہوئے، تھکے ہوئے۔

اور تعجب ہے، افسوس!
یہ بے درد گویا —
میں ان خاکی پوشوں کی بات کر رہا ہوں —

(یہی ہے وہ لمحہ جب بات کہہ دینی چاہیے
یہی ہے وہ لمحہ جب بات کو ننگا کر کے کہہ دینا چاہیے)
اچھا شعر
آنکھ کے مانند ننگا ہوتا ہے
آہ! لیکن میں نے
سیسے کے بنے ہوئے حرفوں کے ساتھ پیمان باندھ رکھا ہے۔
اور سیسے کے حروف
ایک زمانے سے عریانی سے ڈرتے ہیں
پھر گویا
میرا کہنا نہ کہنے ہی کے برابر ہونا چاہیے۔

پھر بھی چاہیے کہ میں اپنے ایمان کے صندوق کا ڈھکنا کھول دوں

اور دیکھوں کہ آیا اس میں

میری آنکھ کے قامت کے برابر کسی تمثیل کی بوسیدہ ململ
کا بنا ہوا کوئی مٹیالا کُرتا کہیں ہے یا نہیں۔

ہاں ہے)۔

— میں خاکی پوشوں کی بات کر رہا تھا۔

گویا یہ بے درد

نہ اس مٹی سے پیدا ہوئے

نہ انھوں نے یہ پانی پیا

اور گویا، میری ہی طرح —

ان میں سے ہر ایک اسی باغ کا پتّا نہ ہو۔

اپنی موت کے لیے باغ

ایک جرّار گروہ تیار کرتا ہے۔

مجھے یقین نہیں آتا، خداوند!

میں جاگتا ہوں یا سو رہا ہوں

دیکھ وہ خزاں کا بھوت جو اپنے پیلے دانتوں سے ہنستا ہوا چلا آ رہا ہے۔

ایک سرخ لمحہ

— جیسے آپ جانتے ہی ہیں —

راستے تک پہنچ چکا ہے۔

جلد یا بدیر
دوزخ کا کوئی غصہ کہے گا :
"بارود ، آگ !"

میں نے یاسمین کا ایک پھول دیکھا
جو بیداری کی کونپل پر آگا ہوا تھا
وہ خاکی پوشوں کو تک رہا تھا ۔
— "میں کس سے کہوں —"
(وہ کیسے گا رہا تھا ، کیسے جھوم رہا تھا)
— "کہ میرا دل لہو ہو رہا ہے
اور کہ میں جل رہا ہوں، جل رہا ہوں ، جل رہا ہوں ، اس لیے
کہ یہ سب کچھ یوں کیوں ہے ؟
اور یہ سب یوں کیوں ہیں
یہ تمام بے حد خطرناک مسکین
یہ نادان تواناؤں کا سب سے
خوفناک گروہ ۔"

محمد رضا شفیعی کدکنی

(م ۔ سرشک)

خراسان کے ایک گاؤں کدکن میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم مشہد کے اسلامی مدارس میں حاصل کی اور عربی اور دینیات کا نصاب پاس کیا ۔ اس کے بعد دانش کدۂ الٰہیات میں دو سال زیرِ تعلیم رہے ۔ مشہد یونیورسٹی کے دانش کدۂ ادبیات سے بی ۔ اے پاس کیا ۔ تہران آکر تہران یونیورسٹی سے پہلے ایم ۔ اے اور پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ ڈاکٹریٹ کے لیے مقالے کا موضوع "فارسی شاعری میں تصور" تھا ۔ اس وقت تک ان کی نظموں کے تین مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں : "شب خوانی"، "زمزمہ ھا"، اور "از زبانِ برگ" ۔ اس کے علاوہ حزین لاہیجی کی زندگی اور شاعری کے بارے میں اُن کی ایک تصنیف بھی شائع ہو چکی ہے ۔ ابو مسلم خراسانی کے بارے میں ایک کتاب اور ہلال صابی کی کتاب "رسومِ دارالخلافہ" کا فارسی ترجمہ بھی اُن کے قلم سے ہے ۔ آج کل ایران کے سینیٹ کی لائبریری میں شعبۂ مخطوطات کے نگران ہیں ۔ یہ نظمیں اُن کے مجموعے "از زبانِ برگ" سے انتخاب کی گئی ہیں ۔

مزامیرِ گلِ داوودی

هیچکس هست که باقطرهٔ باران امشب
همسرائی کند و روشنی گلها را
بستاید تا صبح
که برآید خورشید ؟

هیچکس هست که در نشاهٔ صبح
ساغر خود را بر ساغر آلاله زند
— به لب جو باران —
و بنوشد همهٔ جامش را
شادی کام گیاهی که ننوشیده از ابر کوهر
ساغرِ روشنیِ باران ؟

هیچکس هست که با باد بگوید : در باغ
آشیانها را ویرانه مکن
جوی
— آبشخور پروانهٔ صحرا را — آشفته مدار
و زلالش را کائینهٔ صد رنگ گل ست
با سحرگاهان بیگانه مکن ـ

هیچکس هست که از خط افق
گرد صحرا را ،
دریا را ،
سبزی بکشد
نگذارد که عبور شیطان
از پل نقرهٔ موج
عصمت سبز علفزاران را
تیره و نحس و مجب آلود کند ؟

هیچکس هست در اینجا که بگوید : من
روح هستی را ، در روشنی سوسنها
و مزامیر گل داوودی
بهتر از مسجد یا صومعه می بینم ؟

هیچکس هست که احساس کند
لطف تک بیتی زیبائی را
که خروس شبگیر
می سراید گهگاه ؟

هیچکس هست که اندیشهٔ گلها را
— از سرخ و کبود —
بنگرد صبح در آئینهٔ رود
یا یکی هست

— درین خانہ —

کہ ھمسایہ شود

با سرودی کہ شفق می خواند

بر لب ساحلِ بدرود و درود ؟

گلِ داؤدی کے ساز

کوئی ہے جو آج رات بارش کے قطروں کے ساتھ
مل کر نغمہ سرائی کرے اور پھولوں کی روشنی کی حمد
صبح تک گاتا رہے
تا آنکہ سورج نمودار ہو جائے ؟

کوئی ہے جو صبح کے نشے میں
اپنا پیالہ گلِ لالہ کے پیالے کے ساتھ ٹکرا کر
— ندی کے کنارے —
اور اس درخت کی یاد میں جس نے ریگستان کے بادل سے
روشنی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا
اپنا جام اٹھا کر چڑھا جائے ؟

کوئی ہے جو ہوا سے کہے باغوں میں
آشیانوں کو ویران مت کر
اور ندی کو — میدانوں سے اڑ کر آنے والی

سنہرے پروں والی تتلیوں کے پنگھٹ کو —
گدلا مت کر
اُس کا پانی مت کھنگال
اور اُس شفاف پانی کو جو پھولوں کا رنگین آئینہ ہے
صفائی کی دولت سے محروم نہ کر ؟

کوئی ہے جو صحرا کی ریت میں
اور سمندر میں
افق کی لکیر کھینچ دے ؟
اور شیطان کو لہروں کے چاندی کے مانند سفید پل پر سے
گذرنے نہ دے
تاکہ وہ میدانوں کی تابناک عصمت کو
اپنے سایے سے ،
تاریک اور منحوس رات سے ، آلودہ نہ کر ڈالے ؟
کوئی ہے یہاں جو کہے ، تمیں
زندگی کی روح کو سوسن کے پھولوں کی دمک میں
اور گلِ داؤدی کے سازوں میں
مسجدوں اور مندروں سے بڑھ کر پاتا ہوں ؟

کوئی ہے جو پھولوں کے افکار کو —
— سرخ اور بنفشئی افکار کو —

کہو اٹھتے ندی کے آئینے میں دیکھ پائے ؟
یا کوئی ہے
— اس گھر میں —
جو اس گیت کا ہمسایہ بن جائے
جسے شفق فراق و وصال کے ساحلوں پر گاتی ہے ؟

آواز بیگانه

اینجا دکر بیگانه ای آواز می‌خواند
گاهی — که گاهی نیست ـ
خاموش می ماند
و باز می خواند ـ

او می سراید
—در حضور شب —
برنگ جویبار باغ
خونبرگ گلها را
— که می بالند فردا از شهادتگاه عاشق ها
او می سراید
— در تمام روز ، چون من —
غربتِ یک قدسِ مهجورِ الاهی را
در روشنا برگِ شقایق ها ـ

او می ستاید عشق را در روزگار قلب مصنوعی
او می ستاید صبح را در قعر شب با لهجهٔ خورشید
در قرن بی ایمان ـ

او می ستاید کلبه های سادهٔ ده را
در روزگار آهن و سیمان ۔
او می ستاید لالهٔ عباسی و شبدر را شقایق را
با گونه شان پر شرم
در ازدحامِ کاغذین گلهایِ بی شرمی که می میرند اگر ابری
ببارد نرم ۔

اینجا چنین بیگانه ای آواز می خواند ۔
گاهی ،
خاموش می ماند ۔
و باز می خواند
و باز می خواند ۔

اجنبی کی آواز

میرے اندر شاید کوئی اجنبی گاتا ہے
کبھی کبھی — کیونکہ کبھی وہ ہوتا ہی نہیں ۔
اور کبھی چپ رہتا ہے
اور پھر گانے لگتا ہے ۔

وہ گاتا ہے
— رات بھر —
باغ کی نہروں کی طرز پر

پھولوں کے وصال کا گیت

— جو کل مرجھا کر کر پڑیں گے -

اپنی شہادت گاہوں میں -

وہ گاتا ہے

— دن بھر میری طرح -

اُس خدائی تقدیس کے گیت

جو لالے کے چمکتے ہوئے پتّوں کے اندر بستی تھی

اور جسے لوگوں نے خود سے مہجور کر دیا ہے -

وہ مصنوعی دلوں کے زمانے میں

عشق کی حمد گاتا ہے

وہ رات کی تلواروں کے سائے میں

صبح کے راگ الاپتا ہے

وہ اس ایمان سے محروم زمانے میں

لکڑی کے دیہاتی جھونپڑوں کی ستائش کرتا ہے

وہ اِس لوہے اور سیمنٹ کے دور میں

پھولوں اور سبزہ زاروں کی تعریف کرتا ہے

کاغذی پھولوں کے اس زمانے میں

جو ذرا سا بادل برسنے پر مر جاتے ہیں -

میرے اندر ایسا ہی کوئی اجنبی کانا رہتا ہے
کبھی چپ رہتا ہے
کبھی گانے لگتا ہے
— پھر گانے لگتا ہے

گل های زندان

گیرم که ابر بامدادانِ بهشت ،
اینجا ،
بارید و خوش بارید ،
وان روشنانِ آسمانی را نثارِ این حصارِ بی طراوت کرد ،
یا آفتاب شسته ای
— از ساحل دریاچهٔ اسفند .
با بیکران آئینه اش ، تابید و خوش تابید .
اما ،
مرغان صحرا خوب می دانند :
گل های زندان را صفائی نیست .

اینجا قناری های محبوسِ قفس پیوند
— این بستگانِ آهن و خو کرده با دیوار
بر چوب بستِ حسِ معصوم سعادت های مصنوعی بادالہ ای ،
فنجان آبی ،
چهچهی آواز شان ، خرسند .
هرگز نمی دانند :
کاین تنگنا شان در خورِ شور و نوائی نیست .

زندان کے پھول

مانتا ہوں ، بہشت کی صبح کا بادل

یہاں

برسا اور خوب برسا

اور آسمان کے چمکتے ہوئے قطرے

اس پرانی چار دیواری پر نچھاور کر گیا

جو شادابی سے محروم چلی آتی ہے

یا چھت کی جھیل کے کناروں کی اُجلی اُجلی دھوپ

اپنے بے کراں آئینوں کے ساتھ چمکی اور خوب چمکی

لیکن

میدانوں کے پرندے خوب جانتے ہیں

زندان کے پھولوں سے اُن کی گرد نہیں گئی -

اس پنجرے کی زینت ، یہ معصوم چڑیاں

یہ لوہے کی غلام اور دیواروں کی رسیا

اپنی مصنوعی خوشیوں کے بے مایہ احساس کی جالی پر ،

چند دانوں پر ،

پانی کی پیالیوں پر ،

اپنی آواز کے چیچہوں پر

دلشاد ہیں —

بالکل نہیں جانتیں

یہ تنگ جگہ کسی چہچہے ، کسی نوا کے لائق نہیں ۔

محمد علی سپانلو

(م ۔ ع ۔ سپانلو)

پیدائش تہران میں ۱۹۴۰ء میں ہوئی ۔ تہران یونیورسٹی کے لا کالج کے فارغ التحصیل ہیں ۔ ایک تجارتی ادارے میں کام کرتے ہیں ۔ ان کی نظموں کے چار مجموعے ہیں : "آہ — بیابان"، "خاک"، "رگبار ہا" اور "پیادہ روہا"۔ البیر کامو اور ژاں پول سارتر کی بعض تصانیف کے ترجمے بھی ان کے قلم سے ہیں ۔ اس مجموعے کے لیے نظمیں مؤخرالذکر دو دیوانوں سے انتخاب کی گئی ہیں ۔

عجب غریبم من

عجب غریبم من
عجب نشانی ها گم شده است
وطن همین جاست ، یا من غریب در وطنم ؟
ازین خیابان هرگز نرفته ام
وسقف بازارش را
در اولین گذر عمر خویش می بینم
نمی شناسم این غول را
که قسط هایش را از خون زنده میگیرد
و مزد میخواهد
ز کودک طواف
و بار برانی که میدوند
پی موتورچی ها
تا بار را پیاده کنند
دوباره باران گرفت
و طاق نصرت این روزگار سقفی نیست
که سیل خنجر لغزنده را بلغزاند ـ
به زیر چتر دکان ها پناه خواهی برد
در اجتماع خیس
در اجتماع سرمائی
که باز کام عجیبی
مدام میرود و عطسه میزند ـ

اجنبی

میں بھی کیسا نرالا اجنبی ہوں
کیسی کیسی نرالی نشانیاں کھو چکا ہوں
وطن یہیں ہے ، یا میں وطن میں اجنبی ہوں ؟
میں اس سڑک سے پہلے کبھی نہیں گذرا
اور اس کے بازار کی چھت کو اپنی عمر کی
اس آمد و رفت میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں ۔
میں اس بھوت کو نہیں پہچانتا
جو جیتے جاگتے لہو سے اپنی قسطیں وصول کر رہا ہے
اور ایک گلیوں میں آوارہ پھرتے ہوئے بچے سے
مزدوری کا طالب ہے
اور اُن قُلیوں سے جو
موٹر رکشاؤں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں
تا کہ اپنا بوجھ اُن پر لاد سکیں ۔
پھر گھٹا امڈ آئی ہے
اور اس زمانے کی کوئی یادگار محراب
ایسی چھت نہیں
جو کسی لرزتی ہوئی تلوار کو دہلا دے ۔
تجھے دکانوں کے چھجوں کے نیچے ہی پناہ ملے گی
ایک بھیگے ہوئے ہجوم میں
ایک ٹھٹھرے ہوئے ہجوم میں
جو ایک عجیب زکام میں مبتلا ہے
اور چھینکتا ہوا پیہم چل رہا ہے ۔

احمد رضا احمدی

کرمان میں ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دبستانِ زردشتی کرمان اور دبستان ادبِ صفوی میں پائی۔ اس کے بعد تہران کے مختلف مدارس میں زیرِ تعلیم رہے۔ کئی طرح کے مشاغل اختیار کیے اور ترک کیے۔ کتابوں کی دکانوں میں کام کیا۔ فوج میں دو سال گذارے۔ نشر و اشاعت کے اداروں میں کلرکی کی۔ بعض رسالوں کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ آج کل ایک صنعتی ادارے کے شعبۂ نشر و اشاعت میں ملازم ہیں۔ ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں: "طرح"، "روزنامہ شیشہ ای" اور "وقتِ خوبِ مصائب"۔ نئی ادبی تحریک "موجِ نو" کے سربراہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس مجموعے کے لیے نظمیں "وقتِ خوبِ مصائب" سے اور "از نیما تا بعد" سے لی گئی ہیں جو جدید فارسی شاعروں کے کلام کے مجموعوں میں سے ہے۔

آغاز در تدفین

شهری فریاد می زند :
آری
کبوتری تنها
به کنار برج کهنه می رسد
میگوید :
نه -

بهار ، از تنهائی ، زبانی دیگر دارد
گل ساعت
مرگ روزها و اطلسی ها را
می گوید -

این آواز را چگونه بشهر رسانیم ؟
که آواز
در پشت دروازه های گمان
خواهد مرد . . .
تو با خواب به شهر در آ
تا آواز در چشمانت مخفی باشد -
ما که از دیروز گرم اتاق های استوائی آمده ایم
قرارمان
در پایتخت آواز های صبح است -

تدفین کی ابتدا

شہر کا شہر پکار رہا ہے :
بے شک

ایک تنہا کتوبر
پرانے برج کے کنارے آ نکلتا ہے ،
کہتا ہے :
نہیں -

بہار تنہائی کے مارے اور ہی بولی بولتی ہے
گھڑی کا پھول
دنوں کی موت اور کلِ اطلس کی موت
سنا رہا ہے -
ہم کیونکر اس آواز کو شہر تک لے جائیں ؟
کیونکہ آواز
کان کے دروازوں کے پیچھے
مر جائے گی —
تو نیند لیے شہر میں داخل ہو
تاکہ آواز تیری آنکھوں کے اندر مخفی رہے -

ہم جو استوائی کمروں کے گرم کل سے آ رہے ہیں
ہماری ملاقات
صبح کی آوازوں کے پایۂ تخت میں ہوگی -

گمان ، رو در روی زیبائی

این پنجره ی گشوده به دیوارهای دیروز
ما را در برابر حقیقت ها
و ناگزیری حقیقت ها
به گمان وا می دارد ـ
اما در سایه ی طلای گیسوان
زندگی ، هرگز باطل نخواهد بود ـ
قسم به سرگشتگی انسان
و قسم به جبال
که دروغ ، ریا نیست
دروغ قدیس خود کامه ایست
که هوای گلهای راستی را می پروراند ـ

من برای کاملان می سرایم
که به شک می انجامند
و تو خواهی ماند
و قرار تن

از فصلی

به گلی کبود

شجاعت بهاران قلب است .

عرفان شکوفه ها که از منطق هراس دارد
و عقل

که در قاب دژ خیم استدلال
پژمردن گرفته است

می داند که داخل شدن از دری
که به انهدام روان است
دلیل بر اعتمادی بی گواه است

و این که شب ، در واپسین لحظات ، در اندیشه ی روز است .

پس چرا از آمدن هراس دارید
در آئید

با حریر خواسته های قومی در آئید
که می داند
روبروی هر زیباق
کامل ترین گمان ها
نشسته است .

گمان ، حسن کے روبرو

یہ کل کی دیواروں کے اندر کھلی ہوئی کھڑکی
ہمیں حقیقتوں کے سامنے ،
اور حقیقتوں کی ناگزیری کے سامنے
گمان پر آکساتی ہے ۔
لیکن گیسوؤں کے سنہرے سائے میں
زندگی کبھی باطل نہ ہوگی ۔
انسان کی آوارگی کی قسم
اور قسم پہاڑوں کی
کہ جھوٹ رہا کاری نہیں
جھوٹ ایک خودکام مقدس بزرگ ہے
جو سچائی کے پھولوں کی ہوس پالتا رہتا ہے ۔

میں کاہلوں کی خاطر اپنے گیت گاتا ہوں
جن کا انجام شک پر ہوگا
اور تو باقی رہے گی
اور جسم کا قرار
کسی موسم ہے
کسی نہلائے ہوئے پھول کی جانب
دل کی بہاروں کی شجاعت ہے ۔

گلیوں کا عرفان جو منطق سے ڈرتا ہے

اور عقل

جو استدلال کے سفاک چوکھٹے کے اندر

سر جھانے لگی ہے

جانتی ہے کہ اس دروازے سے داخل ہونا

جو اپنے انہدام کی طرف جا رہا ہو

ایک ایسے اعتماد کی دلیل ہے

جس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اور جانتی ہے کہ رات اپنے آخری لمحات میں

دن کی فکر میں مبتلا ہے۔

پھر تم آنے سے کیوں ڈرتی ہو؟

آ جاؤ نا

اُن لوگوں کی خواہشات کے ریشم کی طرف بڑھو

جو جانتے ہیں

کہ ہر حسن کے روبرو

سست ترین گہانوں کا پہرا لگا رہتا ہے۔

٭٭٭

اس مجموعے سے قارئین کو اندازہ ہو گا کہ فارسی اور اردو کی جدید شاعری میں کس حد تک قرب پایا جاتا ہے - ہیئت اور زبان ہی کی تبدیلیاں ایک جیسی نہیں ، بلکہ رموز و کنایات کے نئے نئے تصورات ، تجربات اور تاثرات کی انفرادیت ، موضوعات میں تنوع کی تلاش اور نئے علوم کی روشنی میں زندگی کی نئی تعبیر کی کوششیں بڑی حد تک یکساں ہیں - آج کی شاعری میں محض زندگی سے اکتاہٹ نہیں پائی جاتی ، بلکہ مجموعی بے اطمینانی کا پرتو ملتا ہے - اور اسی وجہ سے شاعر اپنے ذاتی وصال کا متمنی کم ہے اور زندگی کو اس کے فرسودہ شیووں سے نجات دلانے کا خواہاں زیادہ - دونوں زبانوں کی شاعری نے ایسی دنیائیں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ، جن میں حسن اور عشق کا مفہوم نیا ہو ، جن میں حقیقت اپنی پوری سادگی اور بے ریائی کے ساتھ جلوہ گر ہو اور جن میں انسان کی روح پورے طور پر آزاد ہو سکے -

مجلس ترقی ادب کی چند نئی کتابیں

۱ - کلیات میر : جلد ششم ، مرتبہ کلب علی خاں فائق .. ۳۵/۰

۲ - مقالات حافظ محمود شیرانی : جلد ہشتم ،
مرتبہ مظہر محمود شیرانی ۳۵/-

۳ - مکتوبات سرسید : جلد دوم ، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۵۰/۰

۴ - کلیات سودا : جلد سوم ، مرتبہ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی ۲۲/۰

۵ - پدماوت : مرتبہ گوہر نوشاہی ۵۰/-

۶ - آغا حشر کاشمیری ۔ حیات اور کارنامے : از ڈاکٹر شمیم ملک ۵۰/-

۷ - ذکر رسول مثنوی روسی میں ۔
از ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی ۲۵/-

۸ - تاریخ ادب اردو : جلد اول ، طبع دوم ،
از ڈاکٹر جمیل جالبی ۷۵/-

۹ - تاریخ ادب اردو : جلد دوم ، (طبع دوم)
از ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۲۰/-

۱۰ - حلقۂ ارباب ذوق : از یونس جاوید ۳۵/-

۱۱ - فلسفۂ حسن : از ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ... — ۷۰/-

۱۲ - دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ : (طبع دوم) ۲۰/-

۱۳ - فیض بیدل : از ڈاکٹر عبدالغنی ۳۰/-

۱۴ - اسلوب : از پروفیسر عابد علی عابد ۲۱/-

۱۵ - نذر حمید احمد خاں : مرتبہ احمد ندیم قاسمی ۵۰/-

۱۶ - شذرات فکر اقبال (طبع دوم) ۱۸/-

۱۷ - یادگار داغ : مرتبہ کلب علی خاں فائق ۵۰/-

مجلس ترقی ادب ، کلب روڈ ، لاہور